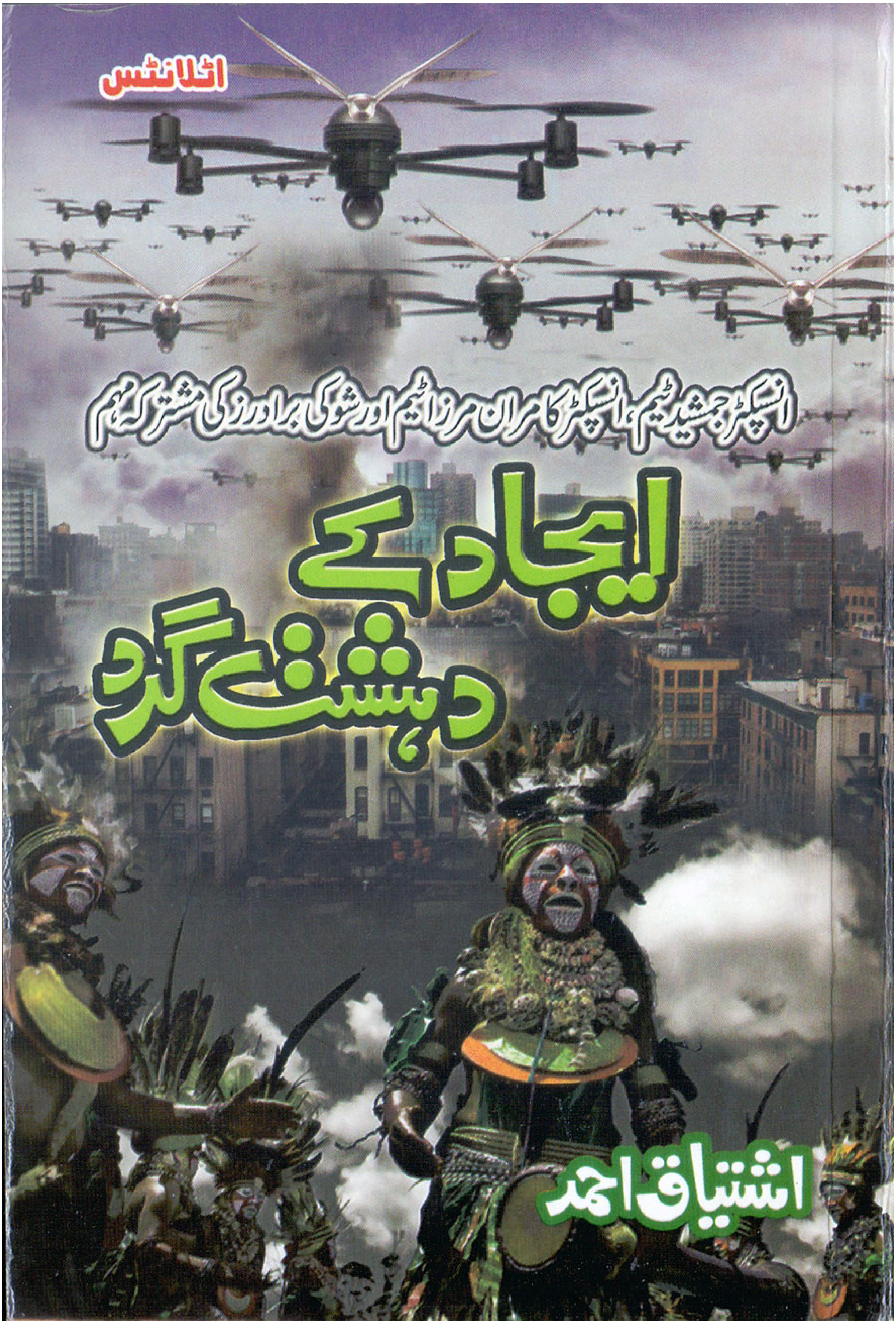

اٹلانٹس
انسپکٹر جمشید ٹیم، انسپکٹر کامران مرزا ٹیم اور شوکی برادرز کی مشترکہ مہم
ایجاد کے
دہشت گرد
اشتیاق احمد

گذارش

اس اسکین کاپی کا مقصد اس ناول کو ڈیجیٹل طور پر محفوظ کر نا ہے۔ اس سے کسی قسم کا منافع یا آمدنی کمانا مقصد ہر گز نہیں ہے۔ اس کو نیک نیتی سے صرف اس غرض سے اسکین کیا ہے کہ اگر کل یہ ناول مارکیٹ سے ختم بھی ہو جائے تو آنے والی نسل کے لیے یہ ناول ڈیجیٹل شکل میں محفوظ رہے۔ ابھی یہ ناول باآسانی دستیاب ہے۔ اگر آپ اس ناول کو خرید کر پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ ہمارے لوکل بک اسٹور اور پبلشنگ ہاؤس کے لئیے بہت فائدہ مند ثابت ہو گا۔ ہم ناول خریدیں گے تو ہی نئے ناول پبلش ہو سکیں گے۔ پبلشنگ انڈسٹری پہلے ہی مشکلات کا شکار ہے۔ ناول خرید کر ہم ان کی مشکلات کچھ حد تک کم کر سکتے ہیں۔ ناول خریدنے کے لیے واٹس ایپ نمبر اور فیس بک لنک نیچے موجود ہے۔

بہت شکریہ

اٹلانٹس پبلیکشنز
A-36 ایسٹرن اسٹوڈیو B-16 سائٹ، کراچی.
0300-2472238, 32578273
ای میل: atlantis.publications@hotmail.com
www.inspectorjamshedseries.com

https://www.facebook.com/InspectorJamshed

03002472238

Atlantis Publications

تفریح بھی، تربیت بھی

اٹلانٹس پبلیکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول	ایجاد کے دہشت گرد
نمبر	انسپکٹر جمشید سیریز 803
اشاعت	دسمبر ۲۰۱۶ء
پبلشر	فاروق احمد
قیمت	280 روپے

ISBN 978-969-601-147-7

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

اٹلانٹس پبلیکیشنز

A-36 ایسٹرن اسٹوڈیو B-16 سائٹ، کراچی۔

0300-2472238, 32578273, 34268800

ای میل: atlantis@cyber.net.pk

www.inspectorjamshedseries.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود ، فاروق ، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

ایجاد کے دہشت گرد

اشتیاق احمد

اٹلانٹس پبلیکیشنز

ایک بات

اشتیاق احمد صاحب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک برس ہوا ۔ اشتیاق صاحب کی کمی پوری نہیں ہو سکے گی اور بچوں کے جاسوسی ادب میں یہ خلا کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ کم از کم اس وقت تو دور دور تک ایسا کوئی نام نظر نہیں آتا کہ بچے جس کی لکھی کتابیں نیم دلی سے پڑھنے کی طلب رکھتے ہوں۔ ایسا کوئی مصنف نظر میں بھی نہیں جو اشتیاق صاحب کی میراث سنبھال سکے۔

بچوں کے ماہانہ رسالوں میں لکھنے والا کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس میں اس عظیم مصنف کے مستقبل کی ذرا سی جھلک بھی نظر آتی ہو۔

بچوں کی کہانیاں لکھنے والے اس بنیادی خام مال سے عاری ہیں جو کسی بھی مصنف کو اینڈ بلائیٹن ، جے کے رولنگ ، مقبول جہانگیر ، جبار توقیر اور اشتیاق احمد بناتا ہے۔ کسی کی زبان مشکل ہے تو کوئی مکالے کی صلاحیت سے محروم ، کوئی موضوعاتی قحط میں مبتلا ہے تو کوئی تبلیغی بخار کا شکار ...

بنیادی وجہ یہ کہ سب ہی مطالعے سے پیٹ بھر کر محروم ہیں ۔

کم ہی لوگ واقف ہوں گے کہ ایک عمر تک اشتیاق احمد صاحب انگریزی ادب کے اسیر رہے۔ ایڈگر ایلن پو ، ایلسٹر میکلین ، ارل اسٹینلے گارڈنر سے اگاتھا کرسٹی تک سب کو گھول کے پی گئے۔ اس دور میں انگریزی کے ان مصنفوں کے لکھے ناولوں کے ترجمے باآسانی دستیاب ہوا کرتے تھے۔ اشتیاق صاحب کے سامانِ سفر میں ہمیشہ ایسا ہی ایک ترجمہ ضرور دیکھا ۔ انگریزی ادب کے ذریعے انہوں نے خود کو ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ رکھا۔ ادب اور سائنس فکشن کے جدید رجحانات سے آگاہ رہے۔ صد افسوس کہ ہمارے آج کے بچوں کے ادیب اشتیاق احمد کی طرح لکھنا تو چاہتے

ہیں مگر اشتیاق احمد کی طرح پڑھنا نہیں چاہتے۔

زیرِ نظر ناول " ایجاد کے دہشت گرد" تیسرا ناول ہے جو اشتیاق صاحب کی رحلت کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس سال ۲۰۱۶ میں میں اشتیاق احمد صاحب کے بقایا ۲۵ مسودوں میں سے صرف تین ہی پر کام کر پایا۔

ارادہ ہے کہ ۲۰۱۷ کے دوران مزید چھ ناول لائے جا سکیں۔

اس دوران یہ اطلاع بھی آئی کہ کراچی سے شائع ہونے والے ایک غیر معروف رسالے نے انسپکٹر جمشید سیریز پر کسی سے کوئی ناول لکھوا کر قسط وار شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ میری گزارش ہے ایسے تمام نادان دوستوں سے کہ خدا کیلئے اشتیاق احمد صاحب کے کرداروں کو مالِ غنیمت مت جانئے اور ان کو بازار میں مت نچوائیے ... ان کرداروں کا تقدس پامال مت ہونے دیجئے ...

امید ہے بلکہ یقین کامل ہے یہ گذارش پر ہرگز کان نہیں دھرا جائے گا اور ہر ایرا غیرا انسپکٹر جمشید سیریز لکھنے کیلئے گدِھوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا، یہ سوچے سمجھے بغیر کی یہ کردار اشتیاق احمد صاحب کا مال و متاع ہے جس کو لوٹنے کھسوٹنے والا کبھی اشتیاق احمد صاحب کا پرستار اور چاہنے والا نہیں ہو سکتا۔

فیصلہ ایسے لوگوں کے اپنے ہاتھوں میں ہے کہ وہ اشتیاق احمد صاحب کا سامنا روز قیامت کس منہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اس دنیا میں انہیں عدالتی نوٹسوں کی قیامت صغریٰ کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا ... اس لیے ان کرداروں پر لکھنا شروع کرتے وقت کسی اچھے وکیل، کورٹ فیس اور ہرجانے کی رقم کا انتظام ضرور رکھیں اور باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔

آئندہ ناول تک کیلئے اجازت دیجئے

فاروق احمد

دو باتیں

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ:

اس ناول یعنی ایجاد کے دہشت گرد نے مجھے خوب چکر دیئے اور سچ تو یہ ہے کہ میں ناول مکمل کرنے کے بعد بھی چکرا رہا ہوں ... میں نے اس چکرانے کے سلسلے میں فاروق احمد سے بھی مدد لی تھی اور انھیں چکرانے میں حصہ دار بنا لیا تھا ورنہ میں اکیلا اتنے چکر نہیں کھا سکتا تھا۔ مطلب یہ کہ جب دو آدمیوں نے چکر کھائے تو کام آسان ہو گیا ورنہ بیل منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی ...

جی ہاں ... ایک ناول کے مجموعی صفحات جتنے مجھے لکھنے ہوتے ہیں وہ پورے ہوتے نظر آئے اور ناول ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا ... میں پریشان ہوا کہ اب کیا کروں کیونکہ ناول کے صفحات عام طور پر ہمارے درمیان طے ہیں ... اسی مناسبت سے ناول کے پیسے طے ہیں ... چونکہ پیسے طے ہیں اس لیے اتنے ہی صفحات کے آس پاس ناول کو ختم کرنا ہوتا ہے حالانکہ فاروق احمد نے ہمیشہ صفحات زیادہ ہونے پر خوشی کا اظہار کیا اور زائد صفحات کے حساب سے ادائیگی میں کبھی پس و پیش نہیں کی لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ ناول مقررہ صفحات میں ہی ختم ہو جائے اور ان کو زائد ادائیگی نہ کرنی پڑے ... اس طرح میرا ایک ذہن بن گیا ہے ... اس ذہن کے مطابق ناول ختم کرنے کی فکر میں ہوتا ہوں لیکن اس بار معاملہ الٹ ہو گیا ... ناول کے مقررہ صفحات تقریباً پورے ہو چلے تھے اور ناول کا اختتام ابھی بہت دور تھا ... یعنی مقررہ صفحات میں ناول ختم ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

اب ظاہر ہے یہ بات میرے لیے پریشانی کی تھی سو میں نے فاروق احمد کو فون کیا ... صورتِ حال ان کے سامنے رکھی۔ وہ کہنے لگے فکر نہ کریں جتنا جی چاہے ناول لمبا کر دیں کوئی پرواہ نہیں، آپ کو زائد صفحات کا معاوضہ مل جائے گا۔

اس پر میں نے کھل کر ناول پر کام جاری رکھا اور اس وقت ایک حیرت انگیز انکشاف مجھ پر ہوا ...

مجھ سے عام طور پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اب آپ ناول پہلے والے انداز میں نہیں لکھتے ، انداز میں فرق آ گیا ہے۔ خاص طور پر یہ خیال فاروق احمد کا ہے۔

کچھ اور لوگ بھی یہ بات محسوس کرتے ہوں گے لیکن اس بات کا زیادہ تر اور اکثر ذکر فاروق احمد ہی کرتے رہے ہیں اور ان کی بات کے جواب میں میں یہ کہتا رہا ہوں کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں اب پرانے انداز میں لکھنے کی ، لیکن شاید میں ان کے خیال میں پوری طرح ایسا پھر بھی نہ کر سکا اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔

شتر مرغ کا اغوا سے میں نے اپنے طور پر بھرپور کوشش کی کہ اپنے پرانے انداز کی طرف لوٹ جاؤں اور پڑھنے والوں نے صاف طور پر یہ بات کہی بھی کہ واقعی یہ ناول پرانے انداز کا تھا۔

اس کے بعد پھر وہی بات کہی گئی کہ ناول اب پھر پرانے انداز کے نہیں آ رہے ہیں ... میں اس سلسلے میں غور کر رہا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہے لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ موجودہ ناول یعنی ایجاد کے دہشت گرد لکھنے کے دوران جب ناول مقررہ صفحات میں ختم نہ ہوا اور میں نے فاروق سے بات کی اور انھوں نے کھلی چھٹی دے دی جو عام طور پر محمود فاروق اور فرزانہ وغیرہ کو ملا کرتی ہے اور وہ خوب کھل کھیلتے ہیں تو اسی طرح مجھے بھی جب کھلی چھٹی ملی اور میں نے ناول پر کام کیا تو پتا چلا کہ جس جستجو میں میں تھا وہ چیز مل گئی۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ چھٹی میں نے خود اپنے آپ کو دی یا مجھے فاروق احمد نے دی ... فاروق کا خیال ہے کہ یہ چھٹی آپ نے خود اپنے آپ کو دی۔

بہرحال اب میں نے محسوس کیا کہ میرا پرانا انداز سو فیصد لوٹ آیا ہے ...

اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ میرا خیال درست ہے ، میرا پرانا انداز سو فیصد لوٹ آیا ہے یا کتنے فیصد لوٹ آیا ہے ... لوٹا بھی ہے یا یہ صرف میرا خیال ہے ... آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا...

والسلام ...اشتیاق احمد۔

دوست یا دشمن

بھاری قدموں کی آواز نے پروفیسر شنکی چانگ کو چونکا دیا۔
آنے والا اس کا ملازم بٹران تھا۔
پروفیسر کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں ... اس نے چلاّ کر کہا:
''کیوں آئے ہو ... کیا میں نے کہہ نہیں رکھا کہ جب تک میں نہ بلاؤں ... مت آنا۔''
'' جی ہاں آپ نے مجھے یہ ہدایت دے رکھی ہے۔'' بٹران نے پرسکون آواز میں کہا۔
'' تب پھر ... کیوں آئے پھر۔'' پروفیسر نے جھلاّ کر کہا۔
بٹران نے ایک نظر اس پر اور دوسری اس کمرے پر ڈالی جس میں اس وقت وہ پروفیسر کے سامنے کھڑا تھا ... اس کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ چھت کی اونچائی عجیب وغریب سائنسی آلات نصب تھے۔
ان آلات میں سیکڑوں بلب جل اور بجھ رہے تھے ... یہ بلب مختلف رنگوں کے تھے ... ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑی میز تھی ... اس میز کے دوسری طرف ایک آرام دہ کرسی تھی جو چاروں طرف گھوم سکتی تھی ... میز

پر بھی بے شمار آلات تھے ... ان تمام چیزوں پر سے ہوتی بٹران کی نظر پروفیسر شنکی پر آ ٹکی۔

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ... اس کی ڈاڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ سر کے بال بھی بالکل برف جیسے تھے ... آنکھوں پر موٹے شیشوں والا چشمہ تھا ... شکل وصورت کے اعتبار سے وہ ایک خوب صورت انسان تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنی آرام دہ کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔

بٹران کو خاموش پا کر وہ غرّایا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''میرے ایک ساتھی آنے والے ہیں ... وہ جواب دیں گے۔''

''ساتھی ... کیا مطلب؟''

''میرا خیال ہے ... ساتھی بہت آسان لفظ ہے۔'' بٹران مسکرایا۔

''لیکن اس کے باوجود میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھا کیونکہ میں نے تو صرف تمھیں ملازم رکھا ہوا ہے ... تو پھر یہ ساتھی کہاں سے نکل آیا؟'' پروفیسر کا لہجہ بہت نا خوش گوار تھا۔

''کیوں پروفیسر صاحب ... کیا آپ نے تجربہ گاہ کیلئے دو عدد مالی نہیں رکھے ہوئے ہیں اور کھانا پکانے کے لیے دو باورچی بھی ہیں۔''

''اچھا اچھا! تم انھیں اپنا ساتھی کہہ رہے ہو۔''

''ہاں وہ میرے ساتھی ہیں، ہم پانچوں بہت اچھے دوست ہیں۔''

''لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ تم ان کی موجودگی میں مجھ سے کچھ کہو

گے ... اور ان کے آنے سے پہلے پہلے کچھ کہنا نہیں چاہتے ۔"

"یہ بات آپ کی سمجھ میں ابھی آجائے گی پروفیسر صاحب ... آپ فکر نہ کریں، فکر کرنے کے لیے ہم جو ہیں ۔" اس کا لہجہ عجیب سا تھا ۔

"تمہارا لہجہ عجیب سا ہے ...ضرور تمہاری نیت خراب ہے ... خیر بلا لو اپنے ساتھیوں کو اور دکھا دو اپنا اصل روپ مجھے ۔"

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز ابھری اور چار ہٹے کٹے آدمی اندر داخل ہوئے۔

انھیں دیکھ کر بٹران مسکرایا ... اس کی مسکراہٹ بہت خوفناک تھی ۔

"آؤ دوستو ... بیچارے پروفیسر صاحب بہت پریشان ہیں ... کہہ رہے تھے ضرور تمھاری نیت خراب ہے ، کیا ہماری نیت خراب ہے ۔"

"ہرگز نہیں ... ہماری نیت تو بہت نیک ہے۔" وہ چاروں ایک ساتھ چلّائے ۔

"بہت خوب دوستو ... پروفیسر صاحب آپ نے سنا ... ان چاروں نے کیا کہا ہے ... اب آپ کا کیا پروگرام ہے ۔"

"پروگرام تو تم بتاؤ گے اپنا ، میں نہیں ۔"

"آپ اپنی ایجاد ہمارے حوالے کر دیں ... اس ایجاد سے اب ہم کام لیں گے اور آپ ہمارے ملازم بن کر باقی زندگی گزاریں گے ... ظاہر میں آپ ہی ہر چیز کے مالک ہوں گے ... لیکن ہوں گے ہمارے غلام ... اگر زندگی پیاری ہے تو غلامی کی زندگی قبول کر لیں اور اگر زندگی

پیاری نہیں تو ہم اسی وقت آپ کو دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر دیتے ہیں۔'' بٹران کا لہجہ سفاک تھا۔

''اس سے تمھیں کیا حاصل ہو گا۔''

''ہم اس ایجاد سے کروڑوں کمائیں گے عیش کریں گے ... یہ کوئی کم فائدہ ہے۔''

''کروڑوں تو حکومت مجھے ویسے بھی دے دے گی جب میں ملک کے اعلیٰ حکام کے سامنے اپنی ایجاد رکھوں گا تو مجھے بہت بڑے بڑے ایوراڈ دیئے جائیں گے ... وہ تم لے لینا ... مجھے اس دنیا کی دولت کی ضرورت نہیں ... میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تمھارا کیا ارادہ تھا ... یہ صورت بہتر ہے یا تمھاری والی۔''

''یہ آپ کا خالی خولی وعدہ ہے ... آپ موقع پا کر پولیس کو یہاں بلا لیں گے اور ہمیں گرفتار کرا دیں گے لیکن ہم اتنے بے وقوف نہیں ... آپ ہمیں عام مالی ، باورچی اور چوکیدار خیال نہ کریں ... ہم اپنے ملک کے مشہور اور ذہین جرائم پیشہ ہیں ...اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کئی بار کے سزا یافتہ ہیں اور بڑے بڑوں کو چکر دینے کے ماہر ہیں ... آپ کے کمرے آنے سے پہلے ہم تمام انتظامات کر چکے ہیں ... مثلاً ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں ، آپ کے موبائل بھی اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں ... مطلب یہ کہ آپ کسی سے بھی رابطہ نہیں کر سکتے۔''

''اور کچھ۔''

'' عمارت کے تمام دروازے بند ہیں ... ان کی چابیاں ہمارے پاس ہیں لہٰذا آپ کسی طرف بھی فرار نہیں ہو سکتے ۔'' بٹران نے شیطانی انداز میں کہا ۔

'' اور کچھ ؟ '' پروفیسر شنکی نے پرسکون انداز میں کہا ۔

'' کیا یہ کافی نہیں ... اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام انتظامات ناکافی ہیں ۔'' بٹران نے قدرے حیران ہو کر کہا ۔

'' ہاں یہی بات ہے ... تم نے بالکل بھونڈا منصوبہ بنایا ... تمھارے منصوبے کو تو میں چٹکیوں میں اڑا سکتا ہوں ... تم خود کو سمجھتے کیا ہو ... جرائم پیشہ ہو گے اپنے گھر کے ... میری تجربہ گاہ کے نہیں ۔''

'' کیا مطلب ؟ '' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

'' میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کسی بھی دروازے کو کھول سکتا ہوں ... تمھارے لگائے ہوئے ناکے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے ... اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ۔''

یہ کہہ کر پروفیسر نے کرسی میں لگا ایک بٹن دبا دیا۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھٹ کی آواز سے کھل گیا ۔

'' لیکن اس سے کیا ہوگا ۔''

'' باقی دروازے بھی اسی طرح کھل سکتے ہیں ۔''

'' میں نے کہا تو ہے ، اس سے کیا ہو گا ۔''

'' میں کیوں بتاؤں کہ اس سے کیا ہو گا ... ہاں یہ بتا سکتا ہوں کہ

تم نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔"

"پتا نہیں پروفیسر تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو۔"

"اب میں کچھ نہیں کہوں گا ... تمھیں جو کرنا ہے کر گزرو۔"

"گویا آپ کو ہماری تجویز پسند نہیں ... آپ ہمارے غلام بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔"

"نہیں ... البتہ آج کے بعد تم میرے غلام ہو گے ... پہلے ملازم تھے ... اب بغیر تنخواہ کے میرے آگے پیچھے پھرو گے ... تم نے برے وقت کو خود آواز دی ہے ... میرا تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔"

اب بٹران اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"یہ اس طرح نہیں مانیں گے ... انھیں قید کرنا ہو گا ... پھر یہ خود ہماری انگلیوں پر ناچیں گے۔"

"جو حکم باس۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

"کیا کہا ... باس ... تم نے بٹران کو باس کہا۔" مارے حیرت کے پروفیسر شنکی کے منہ سے نکلا۔

"ہاں باس ... ہمارا پانچ آدمیوں کا دراصل ایک گروہ ہے ... اس گروہ کا باس میں ہوں۔" بٹران مسکرایا۔

"اور تم میری ایجاد کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

ہم چھپ کر سب دیکھتے ہیں ... آپ نے ایک حیرت انگیز چیز ایجاد کی ہے ... آپ کی ایجاد پوری دنیا میں تہلکہ مچا سکتی ہے اور اگر خفیہ

طور پر کسی طاقت کو پتا چل جائے تو اس ایجاد کے سامنے آنے سے پہلے وہ اسے اڑا لے جانے کی کوشش کرے گی ... اگر اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے تو آپ سے اس ایجاد کا سودا کرنے کی کوشش کرے گی ... ظاہر ہے، وہ بہت بڑی رقم آپ کو دینے کی کوشش کرے گی ... اس طرح یہ سودا دو چار ارب پر بھی ہو سکتا ہے ... اب بتائیں ... ہماری معلومات کس حد تک درست ہیں۔''

''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ایجاد ہے کیا۔'' پروفیسر مسکرائے۔

وہ اب بھی بالکل خوف زدہ نظر نہیں آ رہے تھے اگرچہ ان کے مقابلے پر پانچ منجھے ہوئے جرائم پیشہ تھے۔

ایسے میں بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی ... گھنٹی کی آواز کو سن کر پروفیسر کا چہرہ کھل اٹھا۔

''آ گئے ...'' وہ چلّا اٹھے۔

''کون آ گئے ... کیا کسی کو آنا تھا۔'' مارے پریشانی کے بٹران کے منہ سے نکلا۔

''ہاں میں نے اپنی ایجاد دکھانے کیلئے چند افراد کو دعوت دی تھی لیکن وہ تمھاری طرح جرائم پیشہ نہیں، میرے مخلص ترین دوست ہیں۔''

''اور وہ کون لوگ ہیں۔''

''وہ آتے ہی ہوں گے کیونکہ۔'' پروفیسر مسکرائے۔

''آپ کہتے کہتے رک کیوں گئے۔''

''کیونکہ میں انھیں بتا دیا تھا کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر بھی بیرونی دروازہ کھول سکتے ہیں ... پہلے گھنٹی بجا دیں اور پھر میری بتائی ترکیب پر عمل کریں ... اس طرح دروازہ کھل جائے گا لہٰذا آنے والے خود بخود آ جائیں گے۔''

''کیا مطلب ... کیا آپ کو ہمارے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ دراصل ہم کیا ہیں۔''

''ہاں بے وقوفو ... میں آخر ایک سائنس دان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مجھے دھوکا دے سکو ... تمھارے دونوں کمروں میں خفیہ آلات نصب ہیں ...میں ان کے ذریعے تمھاری باتیں سنتا رہا ہوں۔''

''اوہ ...نن نہیں۔'' مارے خوف کے ان کے منہ سے نکلا۔

''اس لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمھارے جال میں نہیں میرے جال میں تم آئے ہو۔''

''اور اس وقت کون لوگ آئے ہیں ... کیا آپ نے پولیس کو بلایا ہے۔'' بٹران نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''یہی سمجھ لو اور بس ایک آدھ منٹ اور انتظار کر لو اور اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ اس ایک آدھ منٹ میں مجھ پر حملہ کر کے فرار ہو سکتے ہو تو یہ بھی تمھاری خوش فہمی ہو گی کیونکہ تجربہ گاہ کو بھی گھیرے میں پہلے ہی لے لیا گیا ہے ... مطلب یہ کہ تم مکمل طور پر پھنس چکے ہو۔''

''نن ... نہیں۔''مارے خوف کے ان کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں گویا وہ لوگ آگئے تھے جنھیں پروفیسر صاحب نے بلایا تھا۔

وہ دروازے کی طرف مڑے ... پھر منہ بنا کر رہ گئے ...

کیونکہ دروازہ تو آتے ہوئے اندر سے بند کر آئے تھے۔

ادھر پروفیسر ان کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھ رہے تھے ...پھر دروازے کی چٹخنی خود بخود گر گئی اور کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔۔

بٹران اور اس کے چاروں ساتھی پہلے ہی اپنا رخ دروازے کی طرف کر چکے تھے۔

آنے والے پر نظریں پڑتے ہی انھیں اپنے ہوش اڑتے محسوس ہوئے ... ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''نن ... نہیں ... نہیں۔''

☆☆☆☆☆

موت کی تتلی

آنے والے انسپکٹر جمشید ، محمود ، فاروق فرزانہ ، خان رحمان اور پروفیسر داؤد تھے۔

پروفیسر شنکی نے پروفیسر داؤد سے رابطہ کر کے سارے حالات بتائے تھے تب انھوں نے انسپکٹر جمشید کو فون کیا اور وہ فوراً اس طرف روانہ ہو گئے تھے ... یہی وجہ تھی کہ وہ عین وقت پر یہاں پہنچے تھے۔

"اللہ کی مہربانی سے ہم وقت پر پہنچ گئے۔" فاروق کی شوخ آواز ابھری۔

"بالکل ... شکار آپ لوگوں کے سامنے موجود ہے۔" پروفیسر شنکی نے ان پانچوں کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر جمشید نے جونہی ان کی طرف دیکھا ... وہ چونک اٹھے۔

"ارے یہ تو جانے پہچانے لوگ ہیں ... کافی پرانے جرائم پیشہ۔" یہ کہنے کے بعد انھوں نے اکرام سے رابطہ کیا۔

"آجاؤ بھئی اکرام ... شکار تیار ہے۔"

''اوکے سر۔'' اکرام نے فوراً کہا۔

جلد ہی اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا

اس نے بھی پانچوں کو دیکھ کر حیرت بھرے انداز میں سیٹی بجائی۔

''لیجیے پروفیسر صاحب ... یہ کام تو آپ کا کیا ہو ... اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔''

'' میرا خیال ہے ...کچھ اور لوگ بھی اس ایجاد کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں ، اس لیے میں چاہتا ہوں آج اور ابھی اس کو محفوظ ہاتھوں میں دے دوں تاکہ ملک اس سے بھر پور فائدہ اٹھائے... اس ایجاد کے بعد ہمیں کسی بھی ملک سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔''

'' بہت خوب ... اور وہ ایجاد ہے کیا۔''

'' میں بتاتا ہوں ... میں نے ایک ایسی چیز ایجاد کی ہے کہ دشمن ملک کے بہت اندر تک جا سکے گی اور وہاں وار کر کے بحفاظت واپس آ سکے گی ... اور اس ایجاد کے بارے میں جسے بھی پتا چل گیا وہ اسے ضرور حاصل کرنے کی کوشش کرے گا ... لہٰذا ہم اس بات کو ہر ممکن حد تک راز میں رکھیں گے اور ان پانچوں کو قیدِ تنہائی میں اس طرح سے رکھیں گے کہ ان کی کسی سے ملاقات ہی نہ ہونے پائے گی ... کیا خیال ہے آپ کا۔'' پروفیسر ایک ہی سانس میں کہتے چلے گئے۔

'' آپ نے بالکل ٹھیک کہا پروفیسر صاحب ... بے شک آپ ہمیں

بھی نہ بتائیں وہ ایجاد کیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
'' نہیں خیر آپ لوگ تو اس ملک کے بہت پکے اور سچے دوست ہیں، آپ سے بڑھ کر کون محبّ وطن ہو گا ... آپ کو تو بتاؤں گا بھی اور دکھاؤں گا بھی ... پہلے ان پانچوں کا انتظام کر دیجیے ... آپ کے ماتحت انھیں لے جائیں لیکن انھیں عام حوالات میں ہرگز نہ رکھیں۔''
'' آپ فکر نہ کریں ، ہم انھیں ایسی جگہ رکھیں گے جس کا علم بھی کسی کو نہیں ہو گا ، وہاں کوئی ان سے ملاقات نہیں کر سکے گا نہ ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہو گا۔''
'' بس ٹھیک ہے۔'' پروفیسر خوش ہو گئے۔
اب انسپکٹر جمشید نے سب انسپکٹر اکرام سے کہا۔
'' اکرام ... تم جانتے ہو نا ... ان کا کیا کرنا ہے۔''
'' یس سر ... بہت اچھی طرح۔''
پھر انھوں نے دوسرے کمرے میں جا کر خفیہ فورس کے انچارج کو فون کیا ... وہ نہیں چاہتے تھے کہ پروفیسر اور پانچوں مجرموں کے سامنے خفیہ فورس کا ذکر بھی آئے ... آخر کو وہ خفیہ فورس تھی ... اسے خفیہ ہی رہنا چاہیئے تھا ... خفیہ فورس والے کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے ... انہوں نے اپنے چہرے بھی چھپائے ہوئے تھے ... انسپکٹر جمشید نے حال ہی میں خفیہ فورس میں بڑی تبدیلیاں کی تھیں ... انچارج کو بھی بدل دیا تھا ... یہ نیا انچارج ایک تیز طرار سابق انٹیلیجنس افسر تھا اور بھیس بدلنے کا زبردست

ماہر ... بعض اوقات انسپکٹر جمشید بھی اس کو میک اپ میں پہچان نہیں پاتے تھے ... اس کو خاص ہدایات دی گئی تھیں کہ کسی بھی حال میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا اصلی چہرہ لے کر سامنے نہ آئے ... یہاں تک کہ محمود فاروق فرزانہ بھی اس کی اصل شکل سے واقف نہیں تھے ۔

اس وقت بھی وہ میک اپ میں تھا ... اسے دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے کہا: ’’ ’’نمبر ایک ان پانچوں کو نمبر 3 میں لے جاؤ۔‘‘

’’ اوہ ؟‘‘ نمبر ایک نے چونک کر کہا ۔

’’یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ انھیں نمبر تین میں بھیجنا پڑ رہا ہے۔‘‘

’’لیس سر...‘‘

نمبر ایک نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا ... وہ ان پانچوں کو دھکیل لے گئے۔ لے جانے سے پہلے ان کی آنکھوں اور چہروں کو موٹے سیاہ کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا ... اور پھر بند گاڑی میں ڈال دیا گیا ... ان کے بیٹھتے ہی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

’’آیئے اب میں آپ لوگوں کو ایجاد کے بارے میں بتاتا ہوں۔‘‘

وہ انھیں ایک اور کمرے کے دروازے پر لے آئے۔

اس دروازے پر ایک عجیب و غریب تالا لگا ہوا تھا ۔

’’ اس تالے کو صرف میں ہی کھول سکتا ہوں ... اس کی چابی اور کسی کے پاس نہیں رہ سکتی ۔‘‘ پروفیسر شنکی یہ کہتے ہوئے مسکرائے ۔

’’یہ کیسے ممکن ہے پروفیسر ۔‘‘ پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

”کیوں پروفیسر صاحب ... یہ کیوں ممکن نہیں۔“

”اس طرح کہ جس کمپنی نے یہ لاک بنایا ہے، اس کے پاس بھی تو چابی ہو سکتی ہے۔“ پروفیسر داؤد مسکرائے۔

”اصل کے مطابق تو نہیں ہو سکتی ہے ... کمپنی جو بھی لاک بھی بناتی ہے اس کی چابیاں بھی ساتھ فروخت کر دیتی ہے... اب اگر وہ اس کی چابیاں اپنے پاس بھی رکھتی ہے تو یہ بات دیانتداری کے خلاف ہے۔“ پروفیسر شنکی بھی جواب میں مسکرائے۔

”بات آپ کی ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی کمپنی دیانت دار نہ ہو یا چوروں، نقب زنوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ مل جائے تو وہ ایسا کام کرے گی یا نہیں۔“

”ضرور کرے گی ... بے ایمانی کا امکان تو ہمیشہ رہتا ہے لیکن اگر ایسی بڑی کمپنیاں بھی ایسا کرنے لگیں تو ان کی ساکھ مٹی میں مل جائے ... لوگ ان کسے کاروبار ہی نہ کریں، ان کی بنائی ہوئی اشیاء استعمال ہی نہ کریں ... لیکن میرا خیال ہے ہم غیر ضروری بحث میں الجھ گئے ... یہ صرف امکان کی بات ہے ایک ایسا امکان جو بھرپور احتیاط کے باوجود بھی ٹالا نہیں جا سکتا کیونکہ انسانی فطرت کا پہلے سے پتا نہیں چلایا جا سکتا لہٰذا میں اپنی بات کی طرف آتا ہوں کہ اس تالے کی چابی صرف میرے پاس ہوتی ہے۔“

”معاف کیجیے گا ... کیا اس لاک کی صرف ایک چابی ہے۔“

"نہیں تین ہیں ... یہ چابیاں میں نے اپنی سیف میں رکھی ہوتی ہیں ... وہ بھی سیف کے خفیہ خانے میں۔"

"بہت خوب ... چلیے تو کھولیے پھر دروازہ۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

انھوں نے چابی سے تالا کھول ڈالا ... اور اندر داخل ہو گئے۔

کمرہ کیا تھا ایک بہت بڑا مستطیل ہال تھا۔ اس کمرے کے درمیان میں مستطیل شکل ہی ایک لمبی میز تھی۔ اس میز پر آلات نصب تھے۔

میز کے دونوں سروں پر دو کرسیاں گھومنے والی رکھی تھیں۔

دائیں بائیں بھی کرسیاں تھیں۔

"آپ تشریف رکھیے ... میں آپ کو اپنی ایجاد کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں ... میری نئی ایجاد کا نام ہے ... موت کی تتلی۔"

"کیا ... کہا کہا آپ نے ... موت کی تتلی !!!"

کئی آوازیں ابھریں۔

O

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔

پھر پروفیسر داؤد کی آوازیں ابھری۔

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے ایک عدد تتلی ایجاد کی ہے اور اس کا نام آپ نے رکھا ہے موت کی تتلی ہے۔"

"جی ہاں ... فی الحال یہی کہہ لیں کہ میں نے ایک تتلی ایجاد کی

ہے اور وہ موت کی تتلی ہےلیکن بات ایک تتلی کی نہیں ہم اس تتلی کو جس مقام پر چاہیں بھیج سکیں گے ...مثلاً میں دشمن ملک کے کسی شہر میں اس تتلی کو بھیجنا چاہتا ہوں تو وہ وہاں جائے گی اور تباہی مچائے گی۔''

'' ایک تتلی تباہی مچائے گی ... وہ کیسے ؟''

'' اگر ہم کسی جگہ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو وہاں جانا پڑتا ہے لیکن تتلی کی ایجاد کے بعد ہمیں جانے کی ضرورت نہیں ... تتلی خود جائے گی ... اور وہاں جا کر وقتِ مقرر پر کسی بم کی طرح پھٹے گی ۔''

'' اوہ ... لیکن اس طرح تو تتلی خود بھی ضائع ہو جائے گی۔'' پروفیسر داؤد نے کہا ۔

'' تو کیا ہوا ... میں نے تتلیوں کا پورا ایک لشکر تیار کیا ہے اور مزید تتلیاں تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ...اصل چیز تتلی کا وجود نہیں تتلی میں نصب آلات ہیں اور اس کے پیٹ میں بھرا جانے والا ایٹمی مادہ ہے ... وہ مادہ مقررہ جگہ پر جا کر پھٹے گا ۔''

'' آپ کی ایجاد دشمن ملک کیلئے واقعی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے لیکن جب تک تجربہ نہ ہو جائے، اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔''

'' آج ہم جو یہاں جمع ہیں ، اس کا مقصد تتلی کا تجربہ کرنا ہی ہے ... ہم یہاں شہر سے باہر کسی جگہ تتلی بھیجیں گے اور یہاں لگی اسکرین پر اسے جاتے ہوئے دیکھیں گے ، پھر ایک ویران جگہ پر جا کر اسے گرائیں گے اور وہ خود اس جگہ جا کر اس کی تباہی کا معائنہ کریں گے ۔''

''پروگرام بہت خوب ہے لیکن اس سے پہلے ہمیں حکومت کے علم میں یہ بات لانی ہوگی ورنہ جیسے ہی دھماکا ہوگا تو عجیب وغریب خبریں پھیل جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے ... حکومت سے پہلے اجازت لیں گے پھر دھماکا کریں گے ... پہلے میں آپ کو تتلیاں دکھا دیتا ہوں ... ان کے طریقہ کار کی وضاحت کرتا ہوں ... پروفیسر داؤد صاحب تو میری باتوں کو فوراً سمجھ لیں گے ... باقی لوگوں کی سمجھ میں البتہ ذرا مشکل سے آئیں گی لیکن خیر ... ارے ہاں ... وہ پانچوں کہیں وہ فرار نہ ہو جائیں ... اور اگر ایسا ہوا تو میرے لیے پریشانی والی بات ہوگی۔''

''آپ فکر نہ کریں ... ان کے لیے خاص ہدایات دی ہیں۔''

''لیکن نہ جانے کیوں ... مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ فرار ہو جائیں گے اور میرے لیے مسئلہ بنیں گے ... آپ مہربانی فرما کر پتا کر لیں۔''

''اچھی بات ہے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے خفیہ فورس کے انچارج کا نمبر ملایا ...

فوراً ہی اس کی آواز سنائی دی: ''یس سر۔''

''اور ان کے بارے میں اطمینان ہے کہ وہ وہاں موجود ہیں۔''

''جی بالکل۔''

''دوبارہ چیک کر کے مجھے رپورٹ دو۔''

''بہت بہتر سر۔''

انھوں نے فون بند کر دیا۔

ایک منٹ کے بعد فون کی گھنٹی بجی ...

فون انچارج کا تھا ... وہ کہہ رہا تھا ...

''سب ٹھیک ہے سر۔''

''بہت خوب!'' انھوں نے کہا اور پروفیسر شنکی کی طرف مڑے۔

''ان کی طرف سے بے فکر ہو جایئے۔''

'' ٹھیک ہے ... اب میرا اطمینان ہوگیا ... اب میں اب وہ بکس کھولتا ہوں جس میں تتلیوں کی فوج موجود ہے ... اس سے پہلے یہ بتا دوں کہ انھیں بنانے میں مجھے کئی سال لگے ہیں اور ان کا جو فارمولا ہے اسے میں نے ضائع کر دیا ہے۔''

'' کیا مطلب ... آپ نے بھلا فارمولا کیوں ضائع کیا ...کیا اور تتلیاں بنانیے کی ضرورت پیش نہیں آ سکتیں۔''

'' وہ ان گنت ہیں ... میں نے ایک بار ہی بنا لیں ... ان تتلیوں سے تو بڑی بڑی لمبی جنگیں لڑی جا سکتی ہیں۔''

'' لیکن پھر بھی ... آپ نے فارمولا کیوں ضائع کر دیا ... اس کی ضرورت تو پیش آ ہی سکتی تھی۔''

'' نہیں پیش آئے گی ... آپ ابھی دیکھ ہی لیں گے، آیئے میرے ساتھ ... میں نے اس بکس کو بہت ہی خفیہ جگہ رکھا ہے ورنہ دشمن میرے

بکس کو غائب کر سکتا ہے ... بس سن گن لینے کی ضرورت ہے۔''

وہ کچھ نہ بولے۔ پروفیسر انہیں کچھ سنکی قسم کا آدمی لگا تھا ... اور وہ اس کی بے تکی باتوں سے کچھ کچھ بیزار ہو چلے تھے ... سب سے برا حال فاروق کا تھا ... اس کے چہرے پر بوریت کے کچھ ایسے تاثرات چھائے ہوئے تھے کہ محمود اور فرزانہ کو اس کی طرف دیکھ کر ہنسی آئے جا رہی تھی۔

اب پروفیسر شنکی ان کے آگے چلنے لگے ...

آخر وہ عمارت کے اس حصے سے باہر نکل آئے ...

''یہ کیا پروفیسر صاحب! آپ تو باہر نکل آئے۔''

''ہاں! تتلیوں کی فوج اس حصے میں نہیں ہے ... وہ سامنے آپ کو عمارت کا دوسرا حصہ نظر آرہا ہے۔''

''ہاں بالکل آرہا ہے ... بھلا کیوں نظر نہ آئے جبکہ ہماری نظر کمزور نہیں ہے۔'' فاروق کی آواز ابھری۔ انسپکٹر جمشید نے اسے گھور کر دیکھا۔ پروفیسر شنکی کا منہ بن گیا۔ باقی سب بھی فاروق کو گھورنے لگے...

''لیجیے سب ہی مجھ سے ناراض ہو گئے ... ہے کوئی تک۔''

''نہیں کوئی تک نہیں ہے ... یعنی تمھاری اس بات میں۔'' محمود نے برا سا منہ بنایا۔

'' بالکل ٹھیک کہا محمود۔'' فرزانہ نے فوراً اس کی تائید کی۔

''آپ کے بچے واقعی بہت شوخ ہیں۔'' پروفیسر شنکی کا لہجہ نا خوش

گوار تھا جبکہ پروفیسر داؤد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔'' انسپکٹر جمشید بھی مسکرائے۔

''کیا مطلب ... کس میں شک نہیں۔'' پروفیسر شنکی کا منہ اور زیادہ بن گیا۔

''اس میں کہ یہ بہت شوخ ہیں ... لیکن ان کی شوخی کسی کے لیے تکلیف دہ نہیں ہوتی بلکہ لوگ تو ان کی باتوں سے خوش ہوتے ہیں۔''

''اوہ ہاں واقعی۔'' پروفیسر داؤد چونک کر بولے۔

''میں ذرا اس وقت ان پانچوں کی طرف سے پریشان ہوں۔''

''بٹران اور اس کے چاروں ساتھیوں کی طرف سے؟'' محمود نے پوچھا۔

''جی ہاں! پروفیسر نے فوراً کہا۔

''میں تو نہیں سمجھتا کہ اب ان کی طرف سے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔'' انسپکٹر جمشید بور ہو کر بولے۔

''یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انھیں ان تتلیوں کے بارے میں پتا ہوگا ... یعنی وہ یوں کہ انھوں نے خفیہ طور پر میری نگرانی کر کے تتلیوں کے بارے میں جان لیا ہو گا۔''

محمود فاروق فرزانہ کو اس سنکی سائنسدان پر غصہ آ رہا تھا ... وہ سوچ رہے تھے کہ اس کا نام شنکی نہیں سنکی ہونا چاہیئے تھا ... اگر اس کو شک تھا کہ بٹران اور اس کے ساتھی یہ بات پہلے ہی جان چکے ہیں کہ ایجاد

کہاں چھپائی گئی ہے تو اس کو پہلے ہی اپنا اطمینان کر لینا چاہیے تھا۔دوسری طرف انسپکٹر جمشید پروفیسر شنکی سے کہہ رہے تھے:

"لیکن اب ہم انھیں گرفتار کر چکے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن آپ خود سوچیں ... اگر انھوں نے اس راز میں کچھ اور لوگوں کو شامل کر لیا ہو تو ؟" پروفیسر نے سر کھجا کر کہا۔

" اس بات کا امکان ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو ہو۔" انسپکٹر جمشید بھی اپنی بات پر گویا اڑ گئے تھے ۔

"میں نے ایک خیال ظاہر کیا تھا جو غلط بھی ہو سکتا ہے لہٰذا ہم اب اس بات کو چھوڑتے ہیں۔" پروفیسر شنکی نے قدرے گھبرا کر کہا ۔

وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اور پھر وہ عمارت کے دوسرے حصّے کے نزدیک پہنچ گئے ...

انھوں نے دیکھا ... وہ عجیب سی عمارت تھی۔ کم از کم انھوں نے اپنی زندگی میں اتنی عجیب عمارت نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا اور گول کمرہ تھا ۔ اس کے اوپر چھت تھی ۔ اس کی چھت پر بالکل ایسا ہی گول کمرہ موجود تھا لیکن وہ نیچے والے سے کچھ موٹا تھا۔ پھر اس کے اوپر بھی ایک گول کمرہ تھا اور وہ دوسرے سے قدرے چھوٹا تھا۔

اس طرح تین کمرے بالکل گول اوپر نیچے بنائے گئے تھے ۔

"یہ ہے میری اصل تجربہ گاہ ... میں نے اس میں کبھی بٹران کو نہیں آنے دیا... اس کے چیلوں کو تو میں کیا آنے دیتا۔"

'' بہت خوب ... تب پھر آپ کیوں خوفزدہ ہیں ۔''

'' میں ان کی کاروائیوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکا تھا ... ویسے یہاں سے فارغ ہو کر میں اس نے ملاقات کروں گا اور اس وقت ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کروں گا ۔''

'' چلیے یہ تو ہوا ... اب اس عجیب وغریب عمارت میں داخل ہوتے ہیں ... ان پانچوں کی بات بعد میں کر لیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے پریشانی کے عالم میں کہا ۔

'' میں تالا کھولتا ہوں ۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور دروازے میں لگے تالے کے سوراخ میں داخل کر دی۔ تالا کھلنے کی آواز بھی عجیب تھی۔ انھیں یوں لگا جیسے بہت سی مکھیاں بھنبھنائی ہوں ...

'' یہ کیسی آواز تھی ۔'' پروفیسر داؤد چونک اٹھے ۔

'' ارے نہیں ۔''ان کے منہ سے بچوں کے انداز میں نکلا ... چہرے پر شوخی در آئی ... آواز میں بھی حد درجے شوخی آ گئی تھی ۔

''کیا ہوا پروفیسر صاحب ۔''

'' مجھے پروفیسر داؤد کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ ایسے تالے تو ہم جیسوں کے لیے نئی چیز نہیں ۔''

'' وہ دراصل اس جیسی آواز پہلے نہیں سنی تھی ۔''

'' چلیے خیر ۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے دروازے کو دھکیلا۔

اندر انھیں اب بالکل گول اور بہت بڑا کمرہ دکھائی دیا۔

اس کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی ... یہ اور بات تھی کہ نیلی روشنی والا بلب نظر نہیں آ رہا تھا۔ روشنی چھت کے باریک باریک سوراخوں میں سے چھن چھن کر کے آ رہی تھی ۔ اور روشنی کی ان نیلی کرنوں نے کمرے کے ماحول کو عجیب پراسرار بنا دیا تھا۔

ایسے میں انھوں نے پروفیسر شنکی کی آواز سنی ۔

'' آپ لوگ اس روشنی کو دیکھ رہے ہیں ۔''

'' نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ اسے عجیب سا محسوس کر رہے ہیں ... یہ کیسی روشنی ہے ۔''

'' اس روشنی کا اور ان تتلیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ... اس روشنی کے بغیر تتلیاں حرکت نہیں کر سکتیں ... مطلب یہ کہ یہ روشنی انھیں اڑاتی ہے ۔''

'' یہ کیسے ممکن ہے ۔'' پروفیسر داؤد کے لہجے میں حیرت تھی ۔

'' کیوں پروفیسر صاحب ممکن کیوں نہیں ... اس روشنی کی لہریں ان تتلیوں کو اڑاتی ہیں جیسے سورج کی روشنی سے آج کل بڑے بڑے کام لیے جا رہے ہیں ... یہ نیلی روشنی ان تتلیوں کو توانائی فراہم کرتی ہے ... تو اس روشنی سے بھی میں نے کام لے لیا ... یہ نیلی روشنی کی توانائی بھی دراصل ایک دریافت ہے ۔''

'' خیر دیکھتے ہیں ... پہلے آپ وہ تتلیاں دکھائیں ۔''

'' ضرور کیوں نہیں ... تتلیاں اسی کمرے میں ہیں ... آپ لوگ کمرے کے درمیان میں ایک گول اور بڑی میز دیکھ رہے ہیں نا ... اس میز کے چاروں طرف نیچے خلا نہیں ہے بلکہ لکڑی کی دیوار چاروں طرف لگائی گئی ہے گویا اس میز کی گولائی کے برابر اور اس دیوار کی اونچائی کے برابر اندر جگہ موجود ہے ... بس اس میں وہ تتلیاں بھری ہوئی ہیں۔''

'' اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

'' میز کی اس دیوار میں تالا لگا ہوا ہے ... میں یہ کھولتا ہوں ... بس اس کے بعد تتلیاں آپ کے سامنے ہوں گی۔''

یہ کہہ کر پروفیسر نے تالے کے سوراخ میں چابی گھمائی ...

ایک بار پھر مکھیوں کے بھنبھنانے کی آواز سنائی دی۔

'' پھر وہی آواز۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

'' ہاں وہی آواز ... لیجیے تالا کھل گیا ... اور یہ رہیں تتلیاں۔''

یہ کہتے ہوئے پروفیسر نے دیوار میں بننے والے خلا میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں رکھیں اور انھیں دائیں بائیں ہٹا دیا۔

دوسرے ہی لمحے پروفیسر داؤد کے منہ سے ایک بلند چیخ نکل گئی ... ساتھ ہی ایک اور بات ہوئی۔

☆☆☆☆☆

شواری بنگلہ

چیخ کے ساتھ ہی پروفیسر شنکی دھم سے گرے تھے۔
انھوں نے دیکھا، وہ بے ہوش ہو چکے تھے ...
"یہ کیا ہوا؟" اکرام بولا۔
"تتلیاں غائب ہیں ... پروفیسر شنکی شاید اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے ... میں دیکھتا ہوں زندہ بھی ہیں یا صدمہ جان لے گیا۔"
انسپکٹر جمشید نے کہا اور اس پر جھک گئے ...
نبض چیک کرتے ہی انھوں نے کہا۔
"یہ زندہ ہیں ... صرف بے ہوش ہوئے ہیں ... امید ہے جلد ہوش میں آ جائیں گے ... تم کمرے کی تصاویر لے لو ... میں انھیں دوا سنگھا دیتا ہوں۔"

انھوں نے ایک جیب سے دوا کی ایک شیشی نکالی اور اس کا ڈھکنا اتار کر پروفیسر کی ناک کے قریب کی۔ پروفیسر شنکی نے فوراً ہی گردن ادھر ادھر ہلائی لیکن آنکھیں نہ کھولیں۔ انھوں نے ایک بار پھر دوا سنگھائی... لیکن پروفیسر ہوش میں نہ آئے۔

'' فاروق تمھاری کسی جیب میں روئی ہو گی ۔''

'' ہونی تو چاہیے ۔''

یہ کہہ کر فاروق نے جیب میں ہاتھ ڈالا ... اس کا ہاتھ فوراً ہی باہر آیا، ساتھ ہی اس نے کہا۔

'' یہ لیں روئی ۔''

انسپکٹر جمشید نے اس کے ہاتھ سے روئی لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

پھر بولے: '' یہ روئی ہے ۔''

فاروق نے چونک کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔

اس میں پروفیسر صاحب کی دی ہوئی اسفنج نما ایک چیز تھی ...

پروفیسر داؤد اسے دیکھ کر ہنس پڑے ۔

'' یہ اسفنج کا ٹکڑا ایک خاص چیز ہے اور اس سے خاص موقعوں پر کام لیا جا سکتا ہے ...مثلاً کسی زخم پر اسے لگا دیا جائے تو زخم فوراً خشک ہو جائے گا ... زخم کو دھونے کی بھی ضرورت نہیں .....ہ جراثیم کش ہے ... اس قسم کے اور بھی کام لیے جا سکتے ہیں ... فاروق جانتا ہے کہ اس سے کہاں کہاں کام لیا جا سکتا ہے ۔''

'' یہ لیجیے ابا جان روئی ۔'' فاروق نے جلدی سے کہا ۔

اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں واقعی روئی تھی۔

یہ دیکھ کر محمود نے کہا: '' اللہ کا شکر ہے دوسری بار میں ہی روئی نکل آئی ورنہ عام طور پر تو مطلوبہ چیز چھٹی یا ساتویں بار نکلتی ہے ۔''

فاروق نے تیز نظروں سے اسے گھورا لیکن بولا کچھ نہیں۔

ادھر انسپکٹر جمشید روئی کو دوا سے تر کر چکے تھے۔ جونہی انھوں نے روئی پروفیسر شنکی کے ناک سے لگائی ... انھوں نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں ۔

"مم ... میں ... میں کہاں ہوں ۔"

"آپ اپنی تجربہ گاہ میں ہیں۔"

"اوہ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔" انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ شاید نہیں ... یقیناً بے ہوش ہو گئے تھے ۔"

"اُف مالک میری ایجاد ... میری تتلیاں غائب ہیں ... میری برسوں کی محنت کون ظالم لے گیا ... لیکن یہ کیسے ممکن ہے ... وہ پانچوں ہی اس کے ذمے دار ہیں۔"

"شاید ہ کام ان کا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری ۔

"تب پھر ... کس کا ہے ؟"

"فی الحال اس سوال کا جواب تو میں نہیں دے سکتا ۔"

"اب ... اب کیا ہو گا ۔"

"ہمارے ملک میں یا ہمارے اس شہر میں کون ایسا ہو سکتا ہے جو کسی دوسرے سائنس دان کی ایجاد کو اڑا لے جائے اور اسے استعمال بھی کر سکے ... کیا آپ کے ساتھ ان پانچوں کے علاوہ کوئی اور بھی یہاں

آپ کے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔''

'' میرے ساتھ ... اوہ ہاں ... میرے اسسٹنٹ پروفیسر صباری۔''

'' پروفیسر صباری ... یہ کون ہیں ... کبھی نام سننے میں نہیں آیا۔''

'' میرے ساتھ کام کرتے تھے ... تتلیوں کے سلسلے میں میں جو تجربات کرتا رہا ہوں، اس میں وہ برابر کے شریک رہے ہیں۔''

'' اور ... اب وہ کہاں ہیں۔''

'' وہ ایک ماہ کی چھٹی پر ہیں۔''

'' اور وہ گئے کہاں ہیں ... کہاں رہتے ہیں وہ۔''

'' ان کے گاؤں کا نام شواری بنگلہ ہے۔''

'' فوری طور پر شواری بنگلہ جانا ہو گا ... ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا حلیہ اور دیگر تفصیلات بھی بتا دیں۔''

'' وہ لمبے قد کے دبلے پتلے سے نوجوان ہیں، نیلی آنکھیں اور سنہری بالوں والے، انگریز لگتے ہیں لیکن انگریز ہیں نہیں ... کشادہ پیشانی اور لمبوترہ چہرہ ہے ان کا۔''

'' اب ہمیں اجازت دیں ... پہلے ہمیں یہی کام کرنا ہوگا۔''

'' آپ مجھے اطلاع دیجیے گا۔'' پروفیسر فکرمندانہ انداز میں بولے۔

'' آپ فکر نہ کریں۔''

'' اور پروفیسر صاحب آپ کی کلائی سے خون رس رہا ہے، معمولی سا خون ... شاید گرتے ہوئے کوئی نوک دار چیز چبھی ہو گی۔''

محمود کی آواز پر پروفیسر شنکی نے چونک کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ وہاں سے واقعی ذرا سا خون رس چکا تھا۔

''لائیے میں اسفنج سے خون صاف کر دوں۔'' فاروق نے فوراً کہا۔

انھوں نے بازو آگے کر دیا... فاروق نے اسفنج جیب سے نکالا اور خون آلود جگہ پر رکھ دیا... اس نے اسفنج ہٹایا تو خون بالکل غائب تھا۔

البتہ کلائی پر ایسا نشان موجود تھا جیسے کوئی سوئی لگی ہو۔

''ہم شواری گاؤں جاتے ہیں... یہاں کا معاملہ آ کر دیکھیں گے کہ آخر تتلیوں کا ذخیرہ کیسے غائب کر دیا گیا... یہ کس طرح ممکن ہے۔''

''میں آپ کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔'' پروفیسر شنکی بولے۔

''اور ہم بہت جلد آنے کی کوشش کریں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے بولے۔ ''آئیں بھئی چلیں۔''

اور پھر وہ تجربہ گاہ سے باہر نکل آئے... خان رحمان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی...

''شواری بنگلہ کس طرف ہے جمشید؟'' انھوں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم... پوچھنا پڑے گا۔''

اب انسپکٹر جمشید نے پروفیسر شنکی کو فون کیا۔ سلسلہ ملنے پر بولے۔

''پروفیسر صاحب شواری بنگلہ کہاں ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔''

''گویا آپ نے اپنے نائب سے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کا

گاؤں کہاں ہے ۔''

''نہیں ... ایسی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی ۔''

''خیر ... ہم معلوم کر لیں گے ۔''

یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا ... اب انھوں نے اکرام کے نمبر ملائے ... ادھر سے فوراً اکرام کی آواز سنائی دی ۔

''کیا حال ہیں سر ... خیر یت تو ہے ۔'' اس کی خوشگوار آواز آئی ۔

'' پتا نہیں اکرام ۔''

''کیا پتا نہیں آپ کو ۔'' اکرام چونکا ۔

''یہ کہ پتا نہیں خیریت ہے یا نہیں ۔''

''آپ بھی آج شاید ہلکے پھلکے موڈ میں ہیں ۔''

''میں اس وقت موت کی حد تک سنجیدہ ہوں ۔''

''ارے ... تب تو معافی چاہتا ہوں ... ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ... یہ بتاؤ کہ شواری گاؤں کہاں ہے۔''

''میں ابھی چند منٹ میں آپ کو شواری گاؤں کے بارے میں پتا کر کے بتاتا ہوں ۔''

فون بند کر کے وہ وہیں رکے رہے کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ شواری بنگلہ کس سمت میں ہے، اس وقت تک وہاں سے چلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

پھر پانچ منٹ بعد اکرام کا فون آیا ... اس نے بتایا :

'' شواری بنگلہ روات شہر کا ایک گاؤں ہے ... جب آپ روات پہنچیں گے تو ہر کوئی شواری بنگلہ کے بارے میں بتا دے گا۔''

'' اکرام ... تم واقعی انسائیکلو پیڈیا ہو۔'' انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا۔

اب ان کا سفر شروع ہوا ... روات تک کا فاصلہ طے کرنے میں چار گھنٹے لگ گئے۔

وہاں سے شواری بنگلہ کا پتا پوچھ کر وہ آگے روانہ ہوئے اور آسانی سے وہاں پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جونہی ان کی گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی ... بچے اور بڑے گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔

ایک دیہاتی نے کہا۔

'' کیا چاہیے صاحب ... مکئی کی روٹی اور ساگ تیار ہے۔''

''کیا مطلب ؟''

''کیا آپ کچھ کھانے کے لیے ادھر نہیں آئے۔''

خان رحمان کہنے ہی والے تھے کہ ہم نہیں ... ہم کچھ کھانے کے لیے نہیں آئے کہ ان سے پہلے انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

''ٹھیک ہے ... مکئی کی روٹی اور ساگ ہی لے آئیں۔''

'' تڑکا دیسی گھی کا یا ڈالڈا کا۔''

''دیسی گھی کا۔''

'' ابھی حاضر کرتے ہیں صاحب۔''

اس نے دوڑ لگا دی ... اور ان کے آس پاس کوئی بھی نہ رہ گیا۔

'' ابا جان ... کیا س طرح وقت ضائع نہیں ہو گا ... میرا مطلب ہے کہ ہم اتنی افراتفری میں جلدی جلدی یہاں تک آئے اور اب پروفیسر صباری کا پتا لگانے کے بجائے مکئی کا ساگ کھانے بیٹھ گئے۔'' محمود نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

'' یہ بات نہیں ہے محمود ... دراصل یہ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں ... اور اسی لیے ہم جیسے اجنبیوں کو ان کے بارے میں کھل کر نہیں بتاتے کہ کہیں دشمنی کا کوئی قصہ نہ نکل آئے ... کھانے کے بہانے اس سے ذرا بے تکلفی پیدا ہو جائے گی تو پھر پروفیسر صباری کا پتا بھی یہ آسانی سے بتا دے گا۔'' انسپکٹر جمشید نے تفصیل سے اپنی بات سمجھائی۔

'' اطمینان ہو گیا تمھارا ...'' فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

'' اللہ کا شکر ہے ...'' محمود مسکرایا۔

''ویسے ابا جان اس کے انداز سے ایسا لگا جیسے شہروں سے لوگ اکثر مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھانے کے لیے ادھر کا رخ کرتے ہی رہتے ہیں۔'' فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

'' ہوں ... ہو سکتا ہے ... آج کل کھانے پینے کا شوق کچھ زیادہ ہی زور پکڑ گیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

'' بھئی میری تو بھوک چمک اٹھی ہے یہ بار بار مکئی کی روٹی اور ساگ کا ذکر سنتے سنتے ...'' پروفیسر داؤد کے منہ میں جیسے پانی بھر آیا۔

''مکئی کی روٹی اور ساگ مدتیں گزریں جب کھایا کرتے تھے ... ایسے کھانے تو اب خواب و خیال ہوکر رہ گئے ... چلو بچپن کی یادیں ہی تازہ کرلیں۔'' انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔

''تم نے اچھا کیا جمشید ... اپنے بچپن میں میں نے بھی ساگ اور مکئی کی روٹی بہت کھائی ہے ... مجھے یاد ہے سردیوں کے دن ہوتے تھے، ہم چولھے کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے اور ماں سیدھے توے پر مکئی کی پتلی پتلی روٹیاں پکایا کرتی تھی ... پھر ساگ میں دیسی گھی ڈال کر جب ہمارے سامنے رکھتی تھی تو بس کیا بتاؤں کتنا مزہ آتا تھا ... اب وہ مزے کہاں رہے جمشید ...'' خان رحمان سرد آہ بھر کر رہ گئے۔

''چلو پھر آپ بھی اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرلیں انکل۔'' فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

''لل ... لیکن ...'' فاروق ہکلایا۔

''تمھیں کیا ہوا؟'' محمود نے اسے گھورا۔

''ہم تینوں یہ یادیں کیسے تازہ کریں۔''

''دھت تیرے کی۔'' محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

جلد ہی ساگ اور روٹیاں ان کے سامنے رکھ دی گئیں۔

گاڑی میں اتنی جگہ تھی کہ وہ آمنے سامنے بیٹھ کر آرام سے کھا سکتے تھے ... ساتھ ہی ان کے سامنے کنویں کا پانی بھی رکھ دیا گیا ... ساگ بہت مزے کا تھا اور روٹیاں بہت پتلی پتلی تھیں ... انھوں نے خوب ڈٹ

کر کھایا ... پھر جب وہ فارغ ہو گئے تو خان رحمان نے پوچھا۔
"آپ لوگوں کا کتنا بل بنا ہے؟"
"جی ... بل ... کس چیز کا بل۔"
"بھئی کھانے کا جو ہم نے کھایا ہے ... اس کے کتنے پیسے بنے۔"
"توبہ کریں جی ... آپ تو مہمان ہیں ... مہمانوں سے کوئی پیسے لیتا ہے اور پھر ہم یہ کاروبار نہیں کرتے ... ساگ ہمارے کھیتوں کا ہوتا ہے اور مکئی بھی ... یہاں سے باہر ہم ساگ اور مکئی منڈی میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں ... ہمارا کاروبار تو یہ ہے ... اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم یہاں آنے والوں سے بھی کھانے کے پیسے لیں۔"
"اچھا شکریہ! لیکن ہم اپنی طرف سے آپ کو کچھ تحفے تو دے سکتے ہیں ... یا یہ بھی نہیں کر سکتے۔" خان رحمان مسکرائے۔
"ضرورت تو اس کی بھی نہیں ہے۔"
خان رحمان گاڑی میں اس قسم کی چیزیں رکھتے تھے جو ایسے موقعوں پر دی جا سکتی تھیں ... انھوں نے بہت سے تحفے اٹھا کر انھیں تھما دیئے۔
وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے ... ان میں جو بڑی عمر کا تھا اس نے کہا: "جی ... یہ تو بہت زیادہ چیزیں ہیں اور ہیں بھی قیمتی۔"
"نہیں بس یہ آپ لوگوں کے لیے ہیں۔"
"اچھا جی ... آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"ہمیں آپ سے ایک کام بھی ہے۔"

''آپ حکم کریں ...'' بڑی عمر والے نے پر جوش انداز میں کہا۔

'' شکریہ ! یہاں پروفیسر صباری کہاں رہتے ہیں ۔''

'' پروفیسر جباری ؟ ۔'' اس نے حیران ہو کر کہا۔

'' جباری ی نہیں ... صباری ۔''

'' اس نام کے تو یہاں کوئی شخص نہیں رہتے ۔''

'' کیا آپ یہ بات اچھی طرح کہہ سکتے ہیں ... میرا مطلب ہے پورے یقین سے ۔''

''ہاں ! لیکن اگر آپ بہت زیادہ یقین کی بات چاہتے ہیں تو آپ میرے ساتھ چلیں ... میں اپنے ابا جی سے پوچھ کر بتا دوں گا ... اس گاؤں کے سب سے زیادہ عمر کے لوگوں میں سے ہیں وہ ۔''

'' تو پھر چلیے ۔''

اور پھر وہ وہاں سے پیدل اس گھر تک پہنچے ...

وہاں ایک بہت ہی بوڑھا آدمی چارپائی پر بیٹھا تھا ... لیکن اس کی صحت ٹھیک نظر آ رہی تھی ۔

'' ابا جی ! یہ لوگ گاؤں کے مہمان ہیں ... پروفیسر صباری کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں ۔''

'' پروفیسر صباری ... کون پروفیسر صباری ۔''

'' کیا کچھ عرصہ پہلے تک یہاں اس نام کے ایک بہت پڑھے لکھے آدمی نہیں رہتے تھے ۔''

"نہیں اس نام کا کوئی شخص یہاں نہیں رہتا تھا ... میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"اوہ !" ان سب کے منہ سے نکلا۔

وہ ان سے رخصت ہو کر واپس روانہ ہوئے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"بات یہ ہوئی کہ پروفیسر شنکی چان کو پروفیسر صباری نے دھوکا دیا ہے ... اس نے اپنی فرضی رہائش بتائی تاکہ ہم اس تک نہ پہنچ جائیں۔"

"تب پھر اس بات کا امکان بڑھ گیا ہے کہ ایجاد کا چور بھی پروفیسر صباری ہے۔" پروفیسر داؤد نے کندھے اچکائے۔

"اللہ مالک ہے۔"

وہ سفر کرتے شہر تک پہنچے اور وہاں سے انھوں نے پروفیسر شنکی چان کی تجربہ گاہ کا رخ کیا۔

تجربہ گاہ کا بیرونی دروازہ بند تھا۔ محمود نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اندر گھنٹی بجتی رہی ... لیکن دروازہ کھولنے کے لیے کوئی نہ آیا۔

"لگتا ہے پروفیسر شنکی سوئے ہوئے ہیں۔ محمود گھنٹی بجاتے رہو۔"

محمود نے بار بار گھنٹی بجائی لیکن اندر سے کوئی نہ آیا۔

آخر انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لگتا ہے اندر گڑبڑ ہے ... یہ دروازہ تو بہت مضبوط ہے ... فاروق تم تیزی سے تجربہ گاہ کا ایک چکر لگا ڈالو تاکہ معلوم ہو اندر پہنچنے کا

کوئی راستہ ہے یا نہیں ۔''

فاروق نے دوڑ لگا دی ۔

ایک منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی ۔

''ایک پائپ اوپر والے حصے تک جا رہا ہے ۔''

''بس تو پھر بسم اللہ کرو فاروق ۔''

''ٹھیک ہے ... آپ یہیں ٹھہریں ۔''

اور فاروق نے دوبارہ دوڑ لگا دی ... آخر پانچ منٹ بعد کوئی دروازہ کھول کر فاروق باہر نکل آیا ۔

''صدر دروازہ اندر سے بند نہیں ہے بلکہ دروازے میں جو تالا فٹ ہے وہ لگایا گیا ہے ... اس لیے میں صدر دروازہ نہیں کھول سکا ۔''

''چلو کوئی بات نہیں ... اندر داخل ہونے کے قابل تو ہم ہو گئے ہیں ... تم نے کچھ دیکھا ۔''

''نہیں ... میری ساری توجہ تو دروازہ کھولنے پر تھی ... ویسے اندر موت کی خاموشی ہے ۔''

''اندر گڑبڑ ہے ... خیر آؤ دیکھتے ہیں ۔''

اب وہ سیدھے پروفیسر صاحب کی تتلیوں والی تجربہ گاہ میں آئے ۔ پروفیسر شنکی وہاں نہیں تھے ... پہلی تجربہ گاہ کے دروازے بھی اندر سے بند نظر آئے ۔

''پروفیسر شنکی ! آپ کہاں ہیں ۔'' انسپکٹر جمشید نے ہانک لگائی ۔

وہ پروفیسر کی آواز سننے کا انتظار کرتے رہے۔

لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش شروع کر دی ... ان دروازوں میں بھی تالے فٹ تھے لہٰذا جاتے ہوئے کوئی باہر سے تالا لگا گیا تھا۔

''پروفیسر کیا آپ اندر ہیں۔''

ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

اب تو ان کی پریشانی بڑھ گئی۔

''میں دروازہ توڑتا ہوں۔''

''ہاں جمشید ... یہی کرنا ہوگا۔''

انسپکٹر جمشید پیچھے ہٹ کر دروازے کی طرف دوڑ کر آئے اور پوری قوت سے اس سے ٹکرا گئے ... دروازہ زور دار انداز میں ہلا لیکن دوسری طرف نہیں گرا ...

''شاید ایک ٹکر اور۔'' خان رحمان پر جوش انداز میں بولے۔

''ایک ٹکر اور نہیں دو ٹکریں اور ... یہ کافی مضبوط دروازہ ہے۔''

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید پھر پیچھے ہٹ آئے اور دوڑ کر ایک بار پھر دروازے سے ٹکرائے ...

دروازہ پہلے کی نسبت زیادہ زور سے ہلا لیکن گرا نہیں۔

''آپ کا یہ اندازہ بھی درست نکلا۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا فرزانہ ... تیسری ٹکر باقی ہے اور دروازہ

بھی ابھی نہیں گرا۔''

'' اللہ مالک ہے ابا جان ۔''فرزانہ نے پر سکون آواز میں کہا ۔

اور پھر تیسری مرتبہ ان کے دروازے سے ٹکراتے ہی وہ اندر کی طرف گرا ... ساتھ ہی انسپکٹر جمشید بھی کئی قدم اندر کی طرف چلے گئے۔ کمرے کو خالی دیکھ کر باقی لوگ بھی اندر آ گئے ۔

'' یہاں تو کچھ نہیں ہے۔'' انسپکٹر جمشید مایوسی کے عالم میں بولے۔

'' تب پھر ۔''

'' باقی کمروں کے دروازے بھی کھولنے ہوں گے ۔''

'' آپ کا کندھا تو پھر ہو جائے گا زخمی ۔'' فرزانہ نے پریشانی کے عالم میں کہا ۔

'' ہاں ... دفتر سے تالے کھولنے کے ماہرین کو بلانا ہو گا۔''

اکرام کو فون کیا گیا اور وہ جلد ہی تالا کھولنے والوں سمیت وہاں پہنچ گیا ... ان کے پاس ایسے اوزار تھے جن سے دروازے کھولے جا سکتے تھے۔

پھر جونہی دروازہ کھلا وہ دھک سے رہ گئے ۔

☆☆☆☆☆

سوئی اور خون

تتلیوں والی تجربہ گاہ کی ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی۔

کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہ گئی تھی۔ تمام سائنسی آلات توڑ دیئے گئے تھے۔ فرش پر ایک جگہ خون بھی پڑا نظر آرہا تھا۔

ابھی وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی:

"ہم پوری احتیاط سے کمرے میں داخل ہوں گے۔"

"لگتا ہے پروفیسر شنکی کو اغوا کر لیا گیا ہے تا کہ۔" فرزانہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تا کہ کیا؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"تا کہ اس ایجاد کا فارمولا منظر عام پر نہ آ سکے ... اغوا کرنے والے کے علاوہ کوئی اور تتلیوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔"

"اور شاید خود کو اغوا ہونے سے بچانے کے لیے پروفیسر شنکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے ... ان لوگوں سے جنگ کی ہو گی ... فرش پر پڑا خون اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

''صرف خون ہی اس طرف اشارہ نہیں کر رہا بلکہ کمرے کی ہر الٹی پلٹی چیز اس طرف اشارہ کر رہی ہے۔''

''ہاں یہی بات ہے ... پہلے صرف میں کمرے کے اندر داخل ہوں گا ... پھر میں بتاؤں گا کہ باقی لوگ کہاں آکر کھڑے ہو سکتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے جمشید۔'' خان رحمان مسکرائے۔

انسپکٹر جمشید کمرے میں چلے گئے۔ اب انھوں نے پورے فرش کا جائزہ لیا۔ کمرے کی تمام چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ خون ابھی جمنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا واردات کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی ... پروفیسر تجربہ گاہ میں تھے بھی اکیلے ... اس لیے اغوا کرنے والوں کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی ہو گی۔ یہ توڑ پھوڑ اور چیزوں کا الٹ پلٹ ہونا بھی اس لیے تھا کہ پروفیسر شنکی کوئی کمزور آدمی نہیں تھے ... اور ظاہر ہے وہ اغوا کرنے والوں سے بھڑ گئے ہوں گے۔

''خون زیادہ مقدار میں نہیں ہے ... اس لیے میرا خیال ہے زخم معمولی آیا ہوگا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خون اغوا کرنے والوں میں سے کسی کا ہے یا پروفیسر شنکی کا ... اب آپ لوگ بھی اندر آ سکتے ہیں۔ آپ بس یہاں کھڑے ہو کر کمرے کا جائزہ لے سکتے ہیں۔'' انھوں نے اپنے قریب ہی ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا ...

اب وہ بھی وہاں آ کھڑے ہوئے ... اکرام بھی ان کے ساتھ چلا آیا البتہ اس کے ماتحت کمرے کے باہر ہی کھڑے رہے۔

اب محمود فاروق فرزانہ نے بھی خوب غور سے جائزہ لیا۔

پھر فرزانہ نے کہا: ''یہاں میں ایک اور چیز بھی دیکھ رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی ۔

''اور وہ کیا ؟'' محمود اور فاروق نے ایک ساتھ کہا ۔

''تم خود دیکھو ۔'' فرزانہ نے منہ بنایا ۔

''دیکھ لیتے ہیں ... کوئی ہماری نظریں کمزور نہیں ہیں ۔'' محمود نے جل کر کہا ۔

اب انھوں نے بھی فرش کو زیادہ غور سے دیکھا ۔

آخر محمود نے کہا: ''میں نے وہ چیز دیکھ لی ہے ۔''

''اس کا مطلب ہے ... فاروق رہ گیا ۔'' فرزانہ مسکرائی ۔

''ہرگز نہیں ...'' اس نے زوردار انداز میں سر ہلایا۔

انسپکٹر جمشید اس کے انداز پر ہنس پڑے ۔

''تم کس پر ہنسے جمشید ۔'' پروفیسر داؤد نے حیران ہوکر پوچھا۔

''فاروق کے انداز پر ۔''

''اوہ اچھا ... تب تو مجھے اور خان رحمان کو بھی ہنس دینا چاہیے۔'' پروفیسر بولے اور پھر دونوں ہنسنے لگے ۔

''کیا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں انکل۔'' فاروق نے بیچارگی کے عالم میں کہا ۔

''نہیں بالکل نہیں ... تمھارا مذاق بھی کوئی اڑانے کی چیز ہے ۔''

''اصل بات رہی جاتی ہے ... ہاں فاروق بتاؤ کیا نظر آیا ہے۔''

''یہ نظر آیا ہے ...'' فاروق نے فرش پر بیٹھ کر انگلی سے اشارہ کیا۔ انھوں نے دیکھا ، اس کی انگلی ایک پن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔وہ ایک عام پن تھی ، چند کاغذوں کو آپس میں جمع رکھنے کے لیے عام طور پر دفاتر میں عام استعمال کی جاتی ہیں۔

''یہ ... یہ تو عام پیپر پن ہے ... دھت تیرے کی ... اسے نظر بھی آئی تو کیا چیز۔''محمود نے جھلا کر کہا۔

''چلو پھر تم بتا دو تمھیں کیا نظر آیا ہے۔''فاروق نے اسے گھورا۔

''مجھے ... مجھے بھی پن نظر آئی ہے۔''محمود نے مسکرا کر کہا۔

''ہے کوئی تک۔''

''نہیں تک تو واقعی نہیں ہے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''جی اچھا ... لیجیے سنیے ... ایک ایک کومن پن ہے ... اس کی نوک پر خون لگا ہوا ہے۔''

''بالکل ٹھیک ... اس کے علاوہ۔'' انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

''بس یہی کہ یہ ایک عام پن ہے اور اس کی نوک پر خون لگا ہوا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''یہ تو سبھی کو نظر آ رہا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

''تب پھر؟'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''فرزانہ تم کچھ کہنا پسند کرو گی۔''

''جی ہاں کیوں نہیں ... فی الحال اس پن کا مقصد سمجھ میں نہیں آرہا البتہ۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''ایک تو اس میں یہ بات بہت بری ہے کہ بات کو درمیان میں چھوڑ دیتی ہے۔'' فاروق نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''ہاں یہ تو ہے ... سنا فرزانہ۔''

''جی سنا ... اس پن کی موجودگی کا یہاں کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آرہا البتہ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ سوئی پر لگا ہوا خون خشک ہے جبکہ فرش پر والا خون تازہ ہے ... گویا سوئی پر لگا ہوا خون اور ہے جبکہ فرش پر گرا ہوا خون اور ہے۔'' فرزانہ کہتی چلی گئی۔

''بہت خوب فرزانہ ... یہ تم نے بہت کام کی بات بتائی۔''

''دھت تیرے کی ... یار یہ تو پھر بازی لے گئی۔'' محمود جھلّا اٹھا۔

''ہم باتوں میں الجھ جاتے ہیں، یہ عقل سے کام لے لیتی ہے۔''

''اکرام تم نے ان کی باتیں سنیں ... سوئی پر لگا ہوا خون اور ہے اور فرش پر والا اور ... میرا خیال بھی یہی ہے ... اب تم اس سوئی کو بھی محفوظ کر لو اور اس خون کو بھی ... ان کا فارنسک ٹسٹ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں خون ایک ہی انسان کے ہیں یا الگ الگ۔''

''جی اچھا۔'' اس نے کہا اور اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔

لیکن اسی وقت انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں حیرت کی بجلی چمکی۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے ماتحتوں کو اندر آنے سے روک دیا اور

بولے۔ ''ابھی ٹھہرو۔''

وہ وہیں رک گئے ... انسپکٹر جمشید اب باقی چیزوں کا بہت غور سے جائزہ لے رہے تھے۔ آخر ان کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

''اغوا کرنے والے چار افراد تھے۔''

وہ چونک اٹھے ... انھوں نے جوتوں کے نشانات کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی تھی ... وہ تو اس خون اور سوئی میں الجھ گئے تھے۔

''دیکھو یہ چاروں نشانات الگ الگ ہیں اور یہاں ایک پانچویں جوتے کے نشانات بھی ہیں ... امکان ہے کہ وہ پروفیسر شنکی کے ہیں۔''

'' مطلب یہ کہ اغوا کرنے چار آدمی آئے تھے۔'' محمود نے کہا۔

'' فرش پر نشانات کافی بے ترتیب ہیں ... اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ کافی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے پر خیال انداز میں کہا۔

'' ظاہر ہے کہ پروفیسر ان سے بھڑ گئے تھے۔'' فرزانہ نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

'' تو کیا یہ بات عجیب نہیں۔'' وہ مسکرائے۔

'' جی کون سی بات؟''

''یہ سوئی اور یہ خون۔''

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے ... موبائل کی گھنٹی بجی تھی۔ انھوں نے فوراً جیب سے موبائل نکالا۔ فون آئی جی صاحب کا تھا۔

'' السلام علیکم سر۔''

"وعلیکم السلام جمشید ... کہاں ہو۔"

"پروفیسر شنکی کی تجربہ گاہ میں ..."

"پروفیسر شنکی۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں ... کیا آپ انھیں نہیں جانتے۔"

"وہ غیر ملکی سائنس دان جو برسوں سے ہمارے شہر میں آباد ہے۔"

"جی ہاں وہی۔"

"اور تم وہاں کیا کر رہے ہو۔"

"یہاں ایک عدد واردات ہوگئی ہے۔"

"وہ کیا!" آئی جی صاحب چونکے۔

"پروفیسر شنکی کو اغوا کر لیا گیا ہے ...اس سے کچھ دیر پہلے ان کی ایک جدید ترین ایجاد بھی یہاں سے چرا لی گئی تھی ... ایک انتہائی تباہ کن جنگی نوعیت کی ایجاد ..."

"اوہ ... ایک اہم مسئلہ یہاں بھی درپیش ہے ... صدر صاحب تم سے فوری طور پر بات کرنا چاہتے ہیں ... ایوان صدر جانا ہو گا۔"

"سر یہاں ہمارا کام بس مکمل ہونے کے قریب ہے ... یہاں اکرام اور محمود فاروق فرزانہ بھی ہیں ... ضروری کام ان کے حوالے کر کے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"بس تو پھر آجاؤ جمشید ..."

"یس سر۔"

فون بند ہونے کے وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ صدرِ مملکت نے بلوایا ہے۔

چند لمحے تک وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے...

پھر محمود نے کہا۔"چلیے انکل اب اپنا کام مکمل کر لیں۔"

"اس میں بہت وقت لگے گا... تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو... میں رپورٹ بھیج دوں گا۔"

"نہیں انکل... آپ اپنا کام مکمل کر لیں... ہم یہیں ٹھہریں گے ویسے یہ کامن پن ہمیں الجھن میں مبتلا کر رہی ہے، فرش پر خون والی بات تو سمجھ میں آتی ہے، یہ پن والی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اس سوال کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں۔" اکرام نے بیچارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

اور پھر اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اس کمرے کی اور اس فرش کی ہر رخ سے تصاویر لی گئیں۔

خون کی طرف خاص توجہ دی گئی اور سوئی کی بھی تصاویر بنائی گئیں۔

پھر رپورٹ مکمل ہو گئی... اس کے بعد کہیں جا کر اکرام نے کہا۔

"ہم لوگ اپنا کام مکمل کر چکے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" تینوں بولے۔

اکرام کے جانے کے بعد تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
پھر ان کی نظریں خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی طرف اٹھ گئیں۔
''کیا دیکھ رہے ہو بھئی، ہمارے چہروں پر کچھ لکھا نظر آ رہا ہے۔''
خان رحمان گھبرا گئے۔
''جی ہاں!'' فاروق مسکرایا۔
''کیا مطلب؟''
''یہ کہ ہم سخت بور رہے ہیں۔'' فاروق مسکرایا۔
''تب تو غلط لکھا ہے۔''
''وہ کیسے؟''
''اس لیے کہ ہم بالکل بوریت محسوس نہیں کر رہے۔''
''اور یہ بہت اچھی بات ہے۔'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔
''ویسے انکل ... اس اغوا کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے۔''
''کیوں نہ بیٹھ جائیں ... تم لوگ تو ہو جوان اور میں ہوں بوڑھا ... کھڑے کھڑے تھک جاتا ہوں۔'' پروفیسر داؤد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے ہم کمرے میں ہی بیٹھ جاتے ہیں ... ہو سکتا ہے مزید کوئی اہم سراغ نظر آ جائے۔''
''ہوں ٹھیک ہے۔''
وہ تتلیوں کے لیے بنائی گئی جگہ کے گرد کرسیاں رکھ کر بیٹھ گئے۔
تب پروفیسر بولے: ''جیسا کہ پروفیسر شنکی نے بتایا کہ ان کی تتلی

دشمن فوج پر یا تنصیبات پر حملہ کرنے میں بہت کارگر ہے تو اس کی روشنی میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی تیاری کے سلسلے میں پروفیسر صباری نے بطور اسسٹنٹ پروفیسر شنکی کے ساتھ کام کیا تھا ... وہ خود بھی ایک سائنس دان ہے لہٰذا جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اس ایجاد کو کنٹرول کر سکتا ہے تو اس نے پوری ایجاد کو اڑا لیا۔ اس کا فارمولا پہلے ہی پروفیسر شنکی ضائع کر چکے تھے ... لیکن ظاہر ہے تتلی خود ان کی ایجاد ہے اور فارمولا ضائع کر دینے کے باوجود وہ اسے بنا سکتے ہیں اور فارمولا دوبارہ لکھ سکتے ہیں اور چونکہ اس ایجاد کا توڑ چونکہ پروفیسر شنکی کے پاس تھا اور وہ کسی وقت بھی اس کے کھیل کو خراب کر سکتے تھے، اس لیے ایجاد کو چرانے کے بعد اس کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ پروفیسر شنکی کو بھی اغوا کر لیا جائے۔''

''بالکل ٹھیک انکل ... ہم بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔'' محمود بولا۔

'' اس وقت ضرورت اس کیس پر کام کرنے کی ہے اور آئی جی صاحب نے جمشید کو بلا لیا۔''

'' اب صدر صاحب کو کیا معلوم کہ یہاں کیا معاملہ درپیش ہے۔''

''کچھ دیر بعد ان سب کی توجہ اس ایجاد کی طرف ہونے والی ہے پھر وہ سب تمام معاملات بھول جائیں گے۔''

''آپ ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں۔''

'' تم جمشید کو فون کرو ... اگر وہ فون سننے کی پوزیشن میں ہوں گے

تو ضرور سنیں گے ... ورنہ کچھ دیر بعد خود رابطہ کریں گے۔"

"جی اچھا! میں یہ کیسے لیتا ہوں"

اور پھر محمود نے اپنے والد کے نمبر ملائے۔

☆☆☆☆☆

دھمکی

انسپکٹر جمشید کی جیپ ایوان صدر کے دروازے پر پہنچی تو صدر مملکت کے اے ڈی سی ان کی طرف لپکے۔

''صدر صاحب بہت پریشان ہو رہے ہیں۔''

''اللہ اپنا رحم فرمائے، ایسی کیا بات ہو گئی۔'' وہ بڑبڑائے۔

''یہ تو ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں غالباً وہ سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہتے ہیں۔''

''اوہ!'' وہ دھک سے رہ گئے ... پھر اے ڈی سی کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگے ... آخر وہ ان کو لے کر اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جہاں صدر اس وقت موجود تھے۔

''صدر صاحب کی ہدایت ہے کہ صرف آپ کو اندر بھیجا جائے۔''

''اچھی بات ہے باگرا صاحب۔''

''نادم باگرا۔'' وہ مسکرایا۔

''اوہ ہاں! معاف کیجیے گا۔'' انھوں نے جلدی سے کہا۔

ان پورا نام نادم باگرا تھا اور وہ پسند کرتے تھے کہ ان کا پورا نام

لیا جائے۔ اس لیے صرف باگرا کہنے والوں کو فوراً ٹوک دیتے تھے۔

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

انھوں نے ایک نظر غور سے اس کی طرف دیکھا تھا اور یوں محسوس کیا تھا جیسے یہ مسکراہٹ بہت مصنوعی ہے ... پھر سر کو جھٹکا اور آہستہ سے تین بار ٹھک ٹھک کی۔

صدر صاحب اس انداز کو بخوبی جانتے تھے ... لہٰذا فوراً بولے۔

"جمشید تم آگئے۔"

"یس سر۔"

"میں دروازہ کھول رہا ہوں۔"

اسی وقت دروازہ کھل گیا ... وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم سر۔"

"وعلیکم السلام! آؤ جمشید میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

انھوں نے دیکھا، صدر صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے ... وہ اس وقت اپنی مسہری میں نیم دراز تھے۔ مسہری کے سرہانے کے پاس ایک نفیس قسم کی کرسی رکھی تھی ... صدر صاحب نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"شکریہ سر!" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔

"خیریت تو ہے سر۔" انھوں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، یوں لگا جیسے کسی گہری سوچ میں گم

ہو گئے ہوں۔ وہ پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر پورے ایک منٹ بعد ان کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''ابھی میں نے اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ... ہوسکتا ہے یہ کسی پاگل کی خرافات ہوں اور بعد میں ہم مذاق کا نشانہ بنیں ... اس لیے میں نے کوئی ذکر کسی سے نہیں کیا ... بس تمھیں بلایا ہے۔''

''میری پریشانی ہر لمحے بڑھ رہی ہے سر۔'' وہ بولے۔

''میں سمجھتا ہوں جمشید ...'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

چند لمحے بعد پھر بولے: ''ہوسکتا ہے بات کچھ بھی نہ ہو لیکن اگر بات کچھ ہو تو بہت خطرناک ہو گی۔''

''آپ بات بتائیں۔''

''بات یہ ہے کہ مجھے ایک پیغام ملا ہے میرے نمبر پر ... میرے ذاتی پرسنل نمبر پر ... پہلی بات تو اس میں عجیب ہے کہ اس قدر خاص نمبر جس کا علم صرف چند اہم ترین لوگوں کو ہے ... آکر اس شخص تک کیسے پہنچ گیا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے سر۔''

''کیا مطلب جمشید ... تم کہہ رہے ہو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''دیکھیے نا سر ... اس نمبر سے صرف چند لوگ واقف ہیں ... جب ان سے پوچھ کچھ کی جائے گی یا ان کی نگرانی کی جائے گی اور ان کی فون کالیں اور ملنے جلنے والوں کو چیک کیا جائے گا تو ہم آسانی سے

معلوم کر لیں گے کہ کس نے غداری کی ہے۔"

"وہ چند افراد ایسے ہیں کہ ان پر شک کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

"اوہ ... لیکن ان پر نظر تو رکھنی ہی ہو گی کیونکہ سراغرسانی کا پہلا اصول یہ ہے کہ کسی کو شک سے بری نہ سمجھا جائے۔"

"میری طرف سے پوری اجازت ہے ... میں نے تو بس اپنی رائے دی تھی۔"

"اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ کال ٹریس کرنے کا بھی کوئی فاعدہ نہیں ہو گا ... بلکہ شاید آپ نے ایوانِ صدر کے اپنے جاسوسی نظام کے تحت ایسا کرنے کی کوشش بھی کی ہو گی۔"

"ہاں ایسا کیا گیا تھا ... کال ٹریس نہیں ہو سکی تھی ... اور سم اور فون نمبر بھی نہیں۔"

"اس صورت میں تم کس طرح پتا چلاؤ گے۔"

"یہ میرا کام ہے ... لیکن کیا مسئلہ صرف اتنا ہے۔"

"مسئلہ اگر صرف اتنا ہوتا تو پریشانی کی بات نہیں ہوتی۔"

"تب پھر سر۔"

"پریشانی والی بات تو اب آگے آ رہی ہے جمشید۔"

"میں سننے کے لیے بے چین ہوں سر۔"

"تو سنو جمشید ... اس شخص نے فون پر مجھے اپنے خیال میں ایک نیک مشورہ دیا ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسے۔

''نیک مشورہ۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں! نیک مشورہ ... اس نے کہا ہے کہ میں فوری طور پر صدارت سے استعفیٰ دے دوں اور گوشہ نشیں ہو جاؤں اور بس۔''

''اور اگر آپ ایسا نہ کریں تو وہ کیا کرے گا۔'' انھوں نے پرسکون انداز میں پوچھا۔

''ہاں یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے میں نے ابھی تک کسی اور سے اس بارے میں بات نہیں کی، صرف تم سے کر رہا ہوں ... اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ پورے ملک کو درہم برہم کر دے گا اور درہم برہم کرنے کا نمونہ وہ چودہ تاریخ کو دکھائے گا ... اس کا کہنا ہے چودہ تاریخ کی رات ٹھیک گیارہ بجے ہمارے شہر کا مسلم ٹاور ایک دھماکے سے اڑا جائے گا ... تین دن بعد چودہ تاریخ ہے ... اس نے کہا ہے کہ تم لوگ اس کی حفاظت کیلئے جو کر سکتے ہو کرو ... اپنے ملک اور دوست ملکوں کے بہترین سراغرسانوں سے مدد لے لو ... انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا کو بلا لو ... سائنسدانوں سے مشورہ لے لو ... غرض جو کرنا ہے کر لو لیکن ٹاور کو تباہی ہونے سے نہیں بچا سکو گے ... اور یہ پہلی وارننگ ہوگی ... اس کے بعد دوسری عمارت کی نشاندہی کروں گا پھر تیسری ... اور اگر اس کے باوجود بھی استعفیٰ نہیں دیا اور اس پر بھی نہ مانے تو پھر پورے ملک میں خوفناک تباہی کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا ... اور آخر میں اس

نے یہ بھی کہا کہ تباہی اور بربادی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تم صدارت نہ چھوڑ دیں۔"

یہاں تک کہہ کر صدر خاموش ہو گئے ... انسپکٹر جمشید خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے ... آخر ان کے منہ سے نکلا۔

"آپ پہلے اپنی کابینہ کا اجلاس بلا لیں ... ان کے سامنے یہ بات رکھیں اور دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں ... پھر آپ ٹی وی پر پوری قوم سے خطاب کریں اور اس میں یہ ساری صورتحال عوام کے سامنے رکھیں، ان سے پوچھیں وہ کیا کہتے ہیں ... آپ عوام پر چھوڑ دیں ... اس طرح سب کے مشورے کے بعد ٹاور کو بالکل خالی کروا لیا جائے تاکہ نہ تو جانی نقصان ہو اور نہ مال اور سامان ضائع ہو ... چودہ تاریخ کی رات کو حقیقت سب کے سامنے آجائے گی ... اس کے بعد پھر قوم سے خطاب کریں اور دوسری عمارت کا فیصلہ بھی عوام پر چھوڑ دیں ... اسی تیسری عمارت کی باری آ جائے گی ... اگر اس طرح ہو جاتا ہے تو پھر آپ صدارت کو چھوڑنے کا اعلان کر دیں کیونکہ عام تباہی کوئی برداشت نہیں کر سکے گا ... پھر تو آپ صدارت پر رہنا بھی چاہیں گے تو لوگ کہیں گے آپ صدارت چھوڑ دیں ... اس کے بعد حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں یہ معلوم نہیں ... لیکن انشاء اللہ ہم سراغ لگا لیں گے۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

اسی وقت صدر صاحب دھیمے انداز میں مسکرائے، پھر بولے:

''میں نے بھی یہی باتیں سوچیں تھیں لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں ... تم پروفیسر داؤد کی مدد سے ٹاور کو چیک کر لو۔''

''آپ فکر نہ کریں ... ہم اپنے حصّے کا کام کریں گے ... لیکن شاید ٹاور کو تباہ ہونے سے روک نہ پائیں گے۔''

''کیا مطلب جمشید ... یہ تم کیا نے کیا کہا ہے۔''

''حالات سر۔''

''حالات ... کیا مطلب ؟''صدر صاحب چونکے۔

''پروفیسر شنکی چان نے ایک تباہ کن چیز ایجاد کی ہے لیکن وہ ایجاد چوری کر لی گئی ہے، لگتا ہے کہ یہ ایجاد دشمن کے ہاتھ پہنچ چکی ہے اور اب اس کا تجربہ وہ ہمارے ہی اوپر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے ... جس اعتماد کے ساتھ دھمکی دی گئی ہے اس سے یہی نظر آتا ہے کہ یہ اسی تباہ کن ایجاد سے کام لینے کی سوچ رہے ہیں ... اس ایجاد کو نہایت خفیہ طریقے سے کسی بھی عمارت میں داخل کیا جا سکتا ہے اور اس کو ایک پل میں تباہ کر سکتی ہے، ہم اس کی تلاش میں ہیں۔''

''اس سلسلے میں تو پروفیسر شنکی ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے ... اب تک کی تحقیقات اس طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ ان کے اسسٹنٹ اور اس پروجیکٹ پر ان کے ساتھ کام کرنے والے پروفیسر صباری نے نہ صرف ایجاد کو بھی غائب کیا ہے بلکہ پروفیسر کو اغوا بھی اسی نے کیا ہے۔''

''کیا۔'' صدر صاحب چلّائے ... پھر انھوں نے کہا۔

''اچھی بات ہے جمشید ... جیسا تم مناسب سمجھو کرتے جاؤ ... جہاں تک کابینہ سے مشورے کا تعلق ہے اس کے لیے میں مزید سوچ لوں پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے سر ... سیاسی معاملات اور نزاکتوں کو آپ بہتر سمجھتے ہیں ... تو پھر میں ٹاور کو خالی کروانے کا انتظام کرتا ہوں ... جب وہاں کوئی نہیں ہو گا تب اس کی چیکنگ آسان ہو گی۔''

''بہت بہتر۔''

اور پھر وہ وہاں سے نکل کر واپس پروفیسر شنکی کی تجربہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے ... عین اس لمحے ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

انھوں نے دیکھا ... فون محمود کا تھا۔

''ہاں محمود۔'' وہ بولے۔

''آپ فوراً واپس آنے کی کوشش کریں ... یہاں آپ کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' محمود نے جلدی سے کہا۔

''میں ایوانِ صدر سے روانہ ہو چکا ہوں اور صرف پندرہ منٹ بعد تم لوگوں کے پاس ہوں گا ... فکر نہ کرو۔''

''بات یہ ہے کہ ہم تو فکر نہیں کرنا چاہتے لیکن پروفیسر انکل نے ہمیں خوفزدہ کرنے کا شاید ٹھیکا لے لیا ہے۔''

''اوہ اچھا، پھر تو واقعی ڈرنے کی کوئی بات ہے، خیر فکر نہ کرو۔''

'' آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے فکر ۔'' محمود نے منہ بنایا۔
''اچھا بھئی کر لو فکر ... میں تمھیں نہیں روکتا ۔'' انسپکٹر جمشید ہنسے۔
''لیجیے ! آج تو آپ بھی ہمارے انداز میں باتیں کرنے لگے ۔''
اور پھر جلد ہی انسپکٹر جمشید وہاں پہنچ گئے۔
'' خیر تو ہے ... صدر صاحب کے ساتھ کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گئی ۔''
''وہ تو ہو گئی ہے ... اور شاید اس کا تعلق بھی موت کی تتلیوں سے ہے ... اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس گڑبڑ کا کوئی علاج کر سکتے ہیں یا نہیں ... ویسے لگتا ہے ۔''
''موت کی تتلیاں وہاں بھی پہنچ گئیں۔'' خان رحمان حیران رہ گئے۔
اب انھوں نے ساری بات بتائی ... ان کے رنگ اڑتے چلے گئے۔
آخر ان کے خاموش ہونے پر فرزانہ بول اٹھی۔
'' تو کیا صدر صاحب کو دھمکی دینے والا پروفیسر صباری ... ؟ ''
'' شاید ... لیکن بغیر سراغ لگائے کیا کہا جا سکتا ہے ... عین ممکن ہے کہ پروفیسر صباری خود غائب نہ ہوا ہو بلکہ اسے بھی اغوا کیا گیا ہو۔''
'' کیا آپ پروفیسر صباری کو بے گناہ سمجھتے ہیں ؟ ''
'' بغیر تفتیش میں کچھ بھی نہیں سمجھا کرتا اور میں تم کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تم بھی فوراً ہی نتیجے پر نہ پہنچ جایا کرو ... صباری جرم میں شریک ہے یا نہیں یہ کہنا قبل از وقت ہے۔ انسپکٹر جمشید سرزنش والے انداز میں بولے۔

’’ سوری ابا جان ...‘‘ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

’’ لیکن ابا جان ... اس نے اپنے گاؤں کا پتا غلط لکھوایا ہے ، اس بات کو آپ کس خانے میں فٹ کریں گے۔‘‘ محمود نے سوال کیا۔

’’ یہ صرف ایک اشارہ ہے کہ وہ مجرم ہے ، ثبوت نہیں ہے ...‘‘

’’ لیکن آخر اسے کیا ضرورت تھی کہ پتا غلط بتانے کی ...‘‘ فاروق نے چمک کر پوچھا۔

’’ ایک بات اور ... آخر پروفیسر شنکی چان نے اس کے پتے کی تصدیق کیوں نہیں کی ...‘‘ فرزانہ نے لقمہ دیا۔

’’ اس کے دو مطلب نکالے جا سکتے ہیں ... ایک تو یہ کہ پروفیسر اس کو پہلے سے جانتے تھے ... اس لیے اس پر بھروسا کر گئے ... کیونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ بہت عرصے تک ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے کے گھروں کے پتے جانے بغیر ایک دوسرے پر اعتماد کرنے لگتے ہیں ...‘‘ انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

’’ اور دوسرا مطلب ؟‘‘

’’ دوسرا مطلب یہ کہ پروفیسر کو پتا درست یاد نہیں رہ گیا تھا ... سائنسدان اپنے تجربات کی سوچ اور دھن میں مگن رہنے کی وجہ سے عام طور پر ایسی باتیں درست یاد نہیں رکھ پاتے ... پروفیسروں کی غیر حاضر دماغی کے بہت سے قصے مشہور ہیں ... میں ایک ایسے پروفیسر سے واقف ہوں جو صبح اپنی کار ڈرائیو کر کے یونیورسٹی جاتے ہیں اور واپسی پر بس

میں بیٹھ کر گھر واپس چلے جاتے ہیں ... انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ صبح کار پر آئے تھے۔''

''جی ہاں ایک سائنسدان ایسے بھی تھے جو گھر آ کر اپنی ہیٹ اور چھڑی کو آرام کرسی پر ڈال دیا کرتے تھے اور خود ایک کونے میں چھڑی کی طرح کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔'' فاروق مسکرایا۔

''لیکن ہم نے کبھی اپنے پروفیسر انکل کو تو ایسا کرتے نہیں دیکھا نہ سنا ...'' فرزانہ نے یہ کہہ کر پروفیسر داؤد کی طرف دیکھا۔

''بھئی اب میرا منہ مت کھلواؤ ...'' خان رحمان ہنسے۔

''ہائیں ... کیا آپ بھی غائب دماغ ہو جاتے ہیں پروفیسر انکل۔'' فاروق کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں بھئی ... کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے ...'' پروفیسر داؤد نے جھینپتے ہوئے کہا ... پھر بولے:

''تم سے میں بعد میں سمجھوں گا خان رحمان ...''

اور وہ سب ہنس پڑے۔ انسپکٹر جمشید کی سنجیدگی میں البتہ کوئی فرق نہیں آیا تھا ... وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ دیکھ کر ان کی ہنسی کو بریک لگ گئے ... اسی وقت انسپکٹر جمشید نے سر اٹھایا اور بولے:

''اب ہمارے لیے دو مسئلے ہیں ... پہلا مسئلہ ہے ٹاور کی چیکنگ اور دوسرا ہے پروفیسر صباری کی تلاش ... پروفیسر صباری کی تلاش کے

لیے فی الحال ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے لٰہذا ہم فوری طور پر اپنی توجہ ٹاور پر دیں گے ... لیکن میں چاہتا ہوں ہم پہلے گھر جا کر اس سلسلے میں کچھ تیاری کر لیں ..."

"اور کچھ کھا پی بھی لیں ... مجھے بھی اب بھوک ستا رہی ہے۔" پروفیسر داؤد پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں ... ضرور ..."

"ارے واہ ... تمہارا موڈ دیکھ کر تو ہم ڈر ہی گئے تھے کہ پتا نہیں آج کھانا ملے گا بھی یا نہیں ... لیکن یار جمشید تمھارا تو جواب نہیں ۔"

"اللہ کا شکر ہے ۔" انسپکٹر جمشید فوراً بولے ۔

"آپ نے کس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا ابا جان۔" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا ۔

"اس بات پر کہ بقول پروفیسر صاحب ، میرا جواب نہیں۔" انھوں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا ۔

"اللہ کا شکر ہے ۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اور اب تم نے کس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا ہے ۔"

"اس بات پر کہ بقول پروفیسر انکل ... ابا جان کا جواب نہیں۔" فاروق نے فوراً کہا ۔

"دھت تیرے کی ۔" محمود نے جھلا کر کہا ... ساتھ ہی اس نے اپنی ران پر ہاتھ بھی مارا ۔

'' اللہ کا شکر ہے ۔'' فاروق نے جلدی سے کہا ۔

'' اب کیا ہوا ...'' فرزانہ نے اسے بری طرح گھورا۔

'' اس بات پر شکر ادا کیا ہے کہ محمود کا ہاتھ اس کی اپنی ران پر ہی لگا ہے میری ران پر نہیں ۔''

'' حد ہوگئی ... پڑ گئے ایک بات کے پیچھے ... اب چلو یہاں سے۔'' پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا ۔

وہ سب گھر کے دروازے پر پہنچے ...محمود نے گھنٹی بجائی تو فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی ... اور بیگم جمشید کی آواز ابھری ۔

'' دروازہ نہیں کھلے گا ۔''

'' ہائیں کیا ہو گیا دروازے کو ۔'' انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

'' دروازے کو کچھ نہیں ہوا ۔''

'' تب پھر ... کیا آپ کے ہاتھوں کو کچھ ہو گیا ہے امّی جان ۔''

'' اللہ کا شکر ہے میرے ہاتھ بالکل ٹھیک ہیں ۔''

'' تب پھر دروازہ کیوں نہیں کھلے گا ... کیا اس نے کھلنے سے انکار کر دیا ہے ۔'' فاروق کے لہجے میں حیرت تھی ۔

'' دروازہ کھلنے سے پہلے آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ میں نے جو چیزیں تیار کی ہیں وہ کھائے بغیر آپ لوگ کہیں نہیں جائیں گے ۔''

'' اوہ ... بس اتنی سی بات ۔'' انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا ۔

'' یہ اتنی سی بات نہیں ۔'' وہ بولیں ۔

"مہربانی فرما کر بتادیں امی جان ... یہ کتنی سی بات ہے۔"

"اوہو ... تم بات کو لمبا کر رہے ہو ... میرا تو کچھ خیال کرو ... مارے بھوک کے میرا برا حال ہے۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"اوہو ... تو کیا پروفیسر اور خان رحمان صاحب بھی ساتھ ہیں۔"

"ہاں تو اور کیا۔" خان رحمان بول پڑے۔

"تو پہلے کیوں نہ بتایا ... فوراً دروازہ کھول دیتی۔" انھوں نے کہا۔

"اب تو بتا دیا ... اب آپ نے کون سا دروازہ کھول دیا ہے۔"

"اوہ ہاں ! یہ تو میں بھول ہی گئی ... ویسے آپ لوگ اس بات کو لکھ لیں کہ کھانے پینے کے بغیر میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

"چیزیں تیار ہیں نا ... یا تیار کرنی ہیں۔" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

"سو فیصد تیار۔"

"بس تو پھر ہم وعدہ کرتے ہیں۔"

"تو پھر یہ لیں ... میں نے دروازہ کھول دیا۔"

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

☆☆☆☆☆

ٹاور

صحن میں چائے کی میز پر پوری ایک ٹرے مزے دار چیزوں سے بھری ہوئی تھی ... ان میں خاص طور پر پکوڑے اور جلیبی نمایاں نظر آ رہی تھی... ان چیزوں کی خوشبو صحن میں پھیلی تھی ...

"حیرت ہے ... کمال ہے ... خوشی ہے ۔" انسپکٹر جمشید بول پڑے۔

" شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا ... اتنی بہت سی چیزیں ... افسوس ہے غلط ہے بالکل غلط ہے بالکل ناممکن ۔" پروفیسر داؤد نے جلدی سے کہا ۔

اور پھر وہ میز کے گرد بیٹھ گئے ... ابھی انھوں نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے کہ انسپکٹر جمشید کے فون کی گھنٹی بج اٹھی ۔

"خبردار ... فون نہیں سنا جائے گا ... پہلے کھائیں پییں بلکہ لایئے... فون میں سن لیتی ہوں ۔"

"ہاں ! یہ ٹھیک رہے گا ۔"

انسپکٹر جمشید نے یہ کہتے یہ موبائل انھیں دے دیا۔ اسکرین کی طرف دیکھتے ہی ان کا رنگ اڑ گیا ... انھوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ۔

" نن نہیں ... یہ فون آپ ہی سنیں ۔"

''کیا مطلب ... کس کا فون ہے۔'' وہ بولے۔

'' صدر صاحب کا۔''

'' کیا۔'' وہ چلاّئے۔

'' نن نہیں نہیں۔'' بیگم جمشید نے گھبرا کر کہا۔

'' کیا نن نہیں۔''

'' یہ فون آپ کو کچھ کھانے کا موقع نہیں دے گا۔''

'' لاؤ بیگم ... خدا جانے کیا بات ہو۔''

انھوں نے فوراً موبائل لے لیا ... اور پھر آن کر کے بولے۔

'' یس سر۔''

'' جمشید ... ہولناک ... بہت زیادہ خوفناک۔''

'' سر! میں ... میں ہولناک اور زیادہ خوفناک۔''

'' اوہو جمشید ... تم نہیں ... وہ ... تتلی۔''

'' جی ... کیا کہا ... تتلی۔'' انسپکٹر جمشید چلاّئے۔

'' ہاں جمشید ... تتلی ... ٹاور کے عین اوپر ننھی سے تتلی بالکل صاف نظر آ رہی ہے کیونکہ اس کے بدن سے عجیب وغریب روشنیاں نکل رہی ہیں۔''

'' اور سر کیا آپ نے ٹاور کو خالی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔''

'' ہاں بالکل ... عمارت تو اس وقت تک خالی ہو چکی ہو گی ... میرا مطلب ہے ٹاور میں جو دفاتر ہیں ... ان میں کام کرنے والے تو باہر نکل

چکے ہیں البتہ ابھی سامان نہیں نکالا جا سکا۔"

"اوہ اس طرح تو بہت زیادہ نقصان ہوگا ... خیر ہم وہاں جا رہے ہیں ... دیکھ لیں گے اس تتلی کو اور تتلی والے کو۔"

"تتلی والا ... یہ تو کسی۔" فاروق کہنے لگا تھا کہ محمود نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

"بس چپ ... یہ ہرگز کسی ناول کا نام نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو، نہیں ہو سکتا ہو گا۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"حد ہو گئی ... انھیں ان حالات میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"واقعی حد ہوگئی۔" پروفیسر داؤد نے فرزانہ کی تائید کی۔

"شکریہ انکل!" فرزانہ خوش ہوگئی۔

"میرا خیال ہے ... ہمیں جلد ی جلدی ان چیزوں کے ساتھ انصاف کرنا لینا چاہیے ... کیونکہ بیگم سے معاہدہ ہو چکا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" وہ ایک ساتھ بولے اور پھر انھوں نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھائے ... عین اس لمحے بیگم جمشید چلا اٹھیں۔ "نہیں۔"

"کیا نہیں۔"

"آپ لوگوں کو پہلے ٹاور کی طرف جانا چاہیے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم ... ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے دروازہ کس

شرط پر کھولا تھا۔''

''یاد کرانے کی ضرورت نہیں ... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

''تب پھر اب تم ...'' انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

''ہاں اب یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ کو پہلے وہاں جانا چاہیے۔''

''بات تو تمھاری بالکل ٹھیک ہے ... آؤ دوستو!''

''میں ان چیزوں کو محفوظ کر رہی ہوں ... جونہی آپ لوگ فارغ ہوں گھر آجایئے گا اور ان چیزوں سے انصاف کیجیے گا۔''

''ہم ... ہم ضرور انصاف کریں گے لیکن چلتے چلتے۔''

پروفیسر کہتے کہتے رک گئے۔ پھر انھوں نے جیب سے ایک شاپنگ بیگ نکالا اور بہت سی چیزیں اس میں بھر لیں۔

''یہ کیا کر رہے ہیں پروفیسر۔'' خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

''بھئی راستے میں تو کھا ہی سکتے ہیں نا۔'' وہ مسکرا دیے۔

باقی لوگ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے ... اور وہ لگے باہر نکلنے۔

''موقع مل جائے تو مجھے فون کر کے حالات سے باخبر کر دیجیے گا ... ہو سکتا ہے میں آپ کے کچھ کام آ سکوں۔''

''تم بیگم تم ... بھلا تم کیا کر سکو گی۔''

''آپ اس بات کو چھوڑیں ... ہر انسان اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق کام کر سکتا ہے۔''

''اوہ ہاں بالکل ٹھیک کہا بیگم تم نے۔''

اور پھر وہ گھر سے نکل کر خان رحمان کی گاڑی میں بیٹھ گئے ۔
پروفیسر داؤد نے فوراً ہی شاپنگ بیگ میں ہاتھ ڈال دیا۔
''یہ کیا ... ۔''انسپکٹر جمشید ہنسے ۔
''تم لوگ بھی کھاؤ ... تمھیں کس نے روکا ہے ۔''
انھیں شاید زیادہ ہی بھوک لگ رہی تھی۔
آخر قومی ٹاور کے سامنے پہنچ گئے ... وہاں عجیب سماں تھا۔
ٹاور کے گرد ہزارہا لوگ موجود تھے اور ان کے آنے سے پہلے ہی پولیس ٹاور کو گھیرے میں لے چکی تھی۔
انھوں نے اکرام کا نمبر ملایا اور جلدی جلدی اسے صورتِ حال بتائی اور ماتحتوں سمیت وہاں پہنچنے کے لیے کہا ۔
''تتلی کو خبر پورے شہر میں پھیل چکی ہے سر ۔''
''خیر تم بس آجاؤ اور ضروری سامان لے کے ساتھ آنا کیونکہ اس عمارت کی تباہی ہو کر رہے گی ۔''
''جی کیا کہا آپ نے ... کیا ہم اس تباہی کو روکنے کی کوشش نہیں کر سکتے ۔''
''ہم اپنی کوشش ضرور کریں گے ... تتلی کو نشانہ بھی بنایا جائے گا۔''
''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا جمشید ۔''پروفیسر داؤد بول اٹھے ۔
''کیا مطلب ؟''
''تتلی کو نشانہ بنانے والا سخت خطرے میں ہو گا ۔''

''لیکن جمشید ہمیں نشانہ بنانے کا تجربہ تو کرنا ہوگا۔'' خان رحمان پر جوش انداز میں بولے۔

'' خان رحمان ہم سب کچھ کریں گے۔'' انھوں نے یہ کہتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

پھر اکرام وہاں پہنچ گیا... اب انھوں نے اس تتلی کا جائزہ لیا۔

وہ ٹاور کی چوٹی کے بالکل اوپر آ کر ٹک گئی تھی البتہ وہاں چکر لگا رہی تھی۔ وہ کسی پرندے کی طرح ٹاور کے سب سے اوپر والے حصّے پر چکرا رہی تھی ... اس میں سے تیز روشنیاں پھوٹ رہی تھیں.

وہ گاڑی سے اتر آئے ... اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

'' کیا خیال ہے پہلے اسے نشانہ کیوں نہ بنا کر دیکھ لیا جائے۔'' خان رحمان پر جوش سوار تھا۔

''نہیں خان رحمان اس طرح گڑ بڑ ہو سکتی ہے ... تم دیکھ رہے ہو اس وقت اس ٹاور کے گرد ہزار ہا لوگ موجود ہیں۔''

اب ٹاور کے چاروں طرف ہولناک قسم کی افراتفری مچی ہوئی تھی۔

ٹاور سے متعلق لوگ خوف کے عالم میں اپنا اپنا سامان نکال لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلم عمارت کوئی چھوٹی سی عمارت نہیں تھی ... اس عمارت میں سرکاری دفاتر تھے اور اسی کی مناسبت سے ضروریاتِ زندگی کی دکانیں بھی۔ دکانیں ٹاور کے بیرونی طرف تھیں اور چاروں طرف موجود تھیں۔ اس لحاظ سے عمارت کو خالی کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

یہ بات وہ لوگ بھی محسوس کر چکے تھے ... جو اس وقت اس کام میں مصروف تھے ... اس لیے انھوں نے غیر شعوری طور پر بھی فیصلہ کیا تھا کہ بس بہت اہم اور قیمتی چیزیں نکال لی جائیں۔

اور آخر دوسرے دن شام کے وقت عمارت خالی ہو گئی ...

سب لوگ اس میں سے نکل گئے ... اس وقت کہیں جا کر انھیں عمارت میں داخل ہونے کا موقع ملا ... پروفیسر داؤد نے اپنا کام شروع کیا ... آلات کے ذریعہ عمارت کے مختلف حصّوں کا جائزہ لیا ... اس کام میں انھیں کئی گھنٹے لگ گئے ... آخر پروفیسر داؤد نے کہا:

''عمارت میں کوئی آلات وغیرہ نصب نہیں کیے گئے ... مطلب یہ کہ تتلی کسی قسم کے آلات کی بنیاد پر اس عمارت پر حملہ نہیں کرے گی بلکہ اس کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہے ... کیا ہم یہ کوشش کریں کہ اس تتلی کو اڑا دیں۔'' یہاں تک کہہ کر پروفیسر داؤد خاموش ہو گئے۔

'' اول تو میں سمجھتا ہوں کہ تتلی کو اڑا دینا آسان کام نہیں ہو گا ... اگر یہ کام آسان ہوتا تو پروفیسر صباری کبھی تتلی کو نہ بھیجتا۔'' انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

'' لیکن جمشید ... ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔''

''ہاں ہم ایسا کریں گے ... لیکن پہلے اپنا بچاؤ کریں گے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے صدر کے نمبر ملائے... فوراً ہی ان کی آواز سنائی دی: ''ہاں جمشید۔''

انھوں نے مختصر طور پر حالات سنا دیے ... پھر کہا:

''اب ہم اس تتلی کو تباہ کرنے کے لیے قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔''

''جو کرنا ہے کرو جمشید ... اگر ہم ٹاور کو نہ بچا سکے تو پورا شہر خوف کی لپیٹ میں آ جائے گا۔''

''ہم سمجھتے ہیں سر۔''

''اب سوال یہ ہے جمشید ... اگر تم تتلی کو تباہ کر دیتے ہو تو دوسری تتلی آجائے گی ... میرا مطلب ہے یہ علاج تو نہیں ہو گا۔''

''جی ہاں یہ علاج نہیں ہو گا ... ادھر سے تتلی پر تتلی آنے لگے گی ... اس کا علاج تو خیر وہی ہے ... اس کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنا۔''

''بس میں چاہتا ہوں عوام کو کوئی نقصان نہ پہنچیں ... ان کا جانی مالی نقصان نہ ہو ... مجھے چاہے اپنے عہدے سے الگ ہونا پڑے۔''

''سر آپ کا جذبہ بہت خوب ہے۔''

''شکریہ جمشید۔'' یہ کہہ کر صدر صاحب نے فون بند کر دیا۔

اب انسپکٹر جمشید کی ہدایت پر اسپیکر پر اعلان کیا گیا۔

''سب لوگ ٹاور کے پاس سے ہٹ جائیں ... ہم تتلی کو نشانہ بنائیں گے ... اس صورت میں کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا ... اس لیے ٹاور سے جس قدر دور جا سکتے ہیں چلے جائیں۔''

اس اعلان سے ایک بار پھر بھگدڑ سی مچ گئی۔

سب لوگ جلد از جلد ٹاور سے دور جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر اس

کی طرف دیکھ رہے تھے اور آخر ٹاور کے آس پاس صرف پولیس رہ گئی یا پھر وہ تھے ... اب پولیس والوں سے کہا گیا۔

''آپ بھی ایک دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹ جائیں اور اس قدر پیچھے ہٹ جائیں کہ نقصان پہنچنے کا امکان باقی نہ رہ جائے۔''

پولیس نے نہایت نظم وضبط کے ساتھ دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹنا شروع کردیا... یہاں تک کہ ٹاور سے مناسب فاصلے پر پہنچ گئے۔

''رہ گئے ہم .... ہمیں تتلی کو نشانہ بنانا ہے ... ہم تو ٹاور سے زیادہ دور نہیں جا سکتے۔'' فاروق نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''ہم اتنے فاصلے پر تو جا سکتے ہیں نا ... جہاں سے اسے نشانہ بنایا جا سکے۔''

اب وہ پیچھے ہٹ آئے ... دور کھڑے پولیس والے اور عوام انھیں حیرت اور خوف کے عالم میں ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ آخر انسپکٹر جمشید نے ایک رائفل سنبھالی ... اسے چیک کیا اور باہر نکل آئے ...

اس وقت پروفیسر داؤد بول اٹھے۔ ''نہیں جمشید!''

''جی کیا فرمایا آپ نے جمشید۔''

''پہلے رائفل سے تجربہ کرو ... کہیں گولی اچٹ کر تمھیں نہ آ لگے ... ظاہر ہے پروفیسر شنکی نے تتلی کی حفاظت کا بھی تو انتظام کیا ہوگا۔''

''اوہ!'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔ ''اوہ ہاں واقعی ... خیر پہلے میں کسی کنکر سے نشانہ لیتا ہوں ... میرے پیچھے کوئی نہ کھڑا ہو۔''

''لیکن ابا جان آپ کنکر پھینکیں گے کیسے ... صرف ہاتھ سے تو اتنی بلندی پر آپ کنکر نہیں پھینک سکتے۔''

''میں گھر سے اپنا بیگ لے کر چلا تھا اور فاروق کی جیب طرح میرا بیگ بھی عجائب و غرائب سے بھرا ہوتا ہے ... اس میں سے ایک ایسی چیز نکل آئے گی جس کی مدد سے کنکر تتلی سے جا ٹکرائے گی۔''

اب انھوں نے اپنے بیگ میں سے ایک غلیل نکالی... لیکن یہ غلیل جدید طرز کی تھی ... ایک طرح سے یہ پورا پستول تھی لیکن اس میں گولی کی جگہ کنکر رکھا جاتا تھا۔

اس غلیل کی مناسبت سے کنکر بھی بیگ میں موجود تھے۔

انھوں نے غلیل میں کنکر رکھا اور تتلی کا نشانہ لیا ... باقی سب لوگ ان کے آس پاس سے ہٹ گئے ... دور کھڑے پولیس مین اور ٹاور سے تعلق رکھنے والے لوگ اور ادھر ادھر سے جمع ہوجانے والے ہزارہا لوگ اس منظر کو سکتے کے عالم میں دیکھ رہے تھے ...اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا ... کیا ہونے والا ہے ... پھر انسپکٹر جمشید نے بسم اللہ پڑھ کر غلیل کا بٹن دبا دیا۔ کنکر اس میں سے تیر کی طرح نکلا ... ادھر انھوں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور اس جگہ سے دور جا کھڑے ہوئے ... ان سب نے صاف دیکھا ... کنکر تتلی سے ٹکرایا اور ریزہ ریزہ ہوگیا ... بس اس کے ریزے انھوں نے تتلی سے نکلنے والی روشنی میں نیچے گرتے دیکھے ... گویا پورا کنکر اسی حالت میں واپس نہیں پلٹا تھا بلکہ

تتلی سے ٹکرا کر ریزوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

''اب یہ فکر تو نہیں رہی کہ گولی واپس پلٹ پڑے گی للہٰذا اب میں رائفل سے فائر کروں گا۔''

انھوں نے رائفل سنبھال لی ... نشانہ لیا ...

سب کی نظریں ان پر رائفل پر اور تتلی پر بار بار پڑ رہی تھیں۔

آخر اللہ کا نام لے کر انھوں نے فائر کر دیا۔

ساتھ ہی اپنی جگہ چھوڑ دی ...

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی ... بہت عجیب ...

انھوں نے شاید سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو گا ...

☆☆☆☆☆

تتلی کی گرفتاری

تتلی ٹاور کے اوپر جوں کی توں رہی تھی۔
وہ بدستور چکر لگا رہی تھی جبکہ انسپکٹر جمشید کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی بھی پلٹ کر واپس نہیں آئی تھی گویا وہ آگے نکل گئی تھی ...
''یہ کیسے ممکن ہے کہ گولی تتلی کو نہ لگی ہو۔'' خان رحمان بڑبڑائے۔
''اس کا مطلب ہے میرا نشانہ چوک گیا۔'' انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔
''نہیں نشانہ بھی نہیں چوکا۔'' خان رحمان نے فوراً کہا۔
''لیکن تتلی تو اپنی جگہ سے ... اپنے دائرے سے ہلی تک نہیں۔'' انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''میرا خیال ہے ایک تجربہ اور کرتے ہیں۔''
''اس بار ہم دوربین کے ذریعے دیکھیں گے کہ ہوتا کیا ہے۔''
پروفیسر داؤد نے اپنے بیگ سے دوربین نکال لی۔
ایک بار پھر انسپکٹر جمشید نے تتلی کا نشانہ لے لیا ... پروفیسر داؤد نے دوربین کو تتلی پر فوکس کر لیا ...

''کیا آپ کو تتلی نظر آ رہی ہے۔''

''بالکل صاف اور بالکل نزدیک۔''انھوں نے کہا۔

''گویا اب آپ آسانی سے دیکھ لیں گے کہ گولی تتلی کو لگتی ہے یا نہیں اور گولی کا کیا بنتا ہے۔''

''ہاں بالکل۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے تتلی کا نشانہ لے لیا اور اس مرتبہ اور زیادہ احتیاط سے نشانہ لیا... حالانکہ وہ بغیر کسی احتیاط کے اور نشانہ لینے کے فائر کر سکتے تھے اور اتنے تجربہ کار تھے کہ انھیں نشانہ لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی ... جس پستول یا رائفل کی نالی اس سمت میں کرتے تھے، یہ اس چیز کی طرف کرتے تھے جس پر فائر کرنا ہوتا تھا اور ٹریگر دبا دیتے تھے لیکن اس تتلی کے سلسلے میں انھیں احتیاط سے نشانہ لینا پڑ رہا تھا ... اور پھر انھوں نے فائر کر دیا ... ساتھ ہی پروفیسر داؤد کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔''اوہ! یہ میں نے کیا دیکھا؟''

''آپ نے بتایا نہیں۔''

''وہ رائفل کی گولی۔''ان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں کیا ہوا رائفل کی گولی کو۔''وہ بے چین ہو گئے۔

''وہ ... وہ پگھل گئی ... جونہی گولی تتلی کے قریب پہنچی وہ پگھل کر نیچے گرتی نظر آئی۔''

''اوہ۔''ان سب کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

''پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس تتلی کو ختم نہیں کر سکتے۔''

خان رحمان نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو جمشید ...فی الحال تو یہی نظر آرہا ہے کہ ہم اس تتلی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے ... ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں سوال تو یہ ہے ... اور اس سوال کا جواب تم تینوں دو گے۔''انھوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہم تینوں دیں گے ... آپ نے یہ کیوں نہیں کہا کہ فرزانہ دے گی۔''فاروق بوکھلا اٹھا۔

''یہ اس وقت کہوں گا جب تم خود کا ناکام قرار دے لو گے۔''

''کیا ہم جال پھینک کر تتلی کو پکڑ نہیں سکتے۔'' پروفیسر بڑبڑائے۔

اور پھر وہ سوچ میں گم ہو گئی ... کافی دیر تک سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے کے بعد آخر فرزانہ نے چٹکی بجائی۔

''لگتا ہے کوئی ترکیب سوجھ گئی۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''ہاں ... لیکن یہ ضروری نہیں کہ تدبیر کارگر بھی ثابت ہو۔''

''یہ بعد کی بات ہے ...تم ترکیب بتاؤ۔''

''ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہم اس تتلی سے اوپر پہنچ سکتے ہیں ... وہاں ہیلی کاپٹر کو روک کر تتلی کو کسی پھندے کی مدد سے گرفتار کر لیا جائے۔''

فرزانہ کی ترکیب سن کر وہ سب سوچ میں ڈوب گئے۔

آخر پروفیسر داؤد نے کہا: ''اس ترکیب میں اصل سوال یہ ہے کہ

وہ پھندا کس چیز کا ہو، کیونکہ رائفل کی گولی تو اس کے نزدیک جاتے ہی پگھل گئی ... اس لیے وہ جال کسی دھات کا تو ہو نہیں سکتا۔''

''دھاگوں کا تو ہو سکتا ہے۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''تمھارا مطلب ہے ... دھاتوں کا جال نہیں چلے گا۔'' پروفیسر داؤد نے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا تو یہی خیال ہے کہ دھاتی چیزیں جل جائیں گی، غیر دھاتی چیزیں نہیں جلیں گی۔''

''تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے ... میں اپنے ایک واقف کو فون کرتا ہوں ... وہ جال یہیں لے آئے گا۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''ایک تو ہر میدان میں آپ کے واقف نکل آتے ہیں۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

اب انھوں نے پہلے اپنے واقف کو جال کے لیے فون کیا ... اسے تھوڑی سی تفصیل بھی بتائی تاکہ وہ ضرورت کے مطابق جال لا سکے۔

اور پھر پہلے وہاں جال پہنچا ... پھر ہیلی کاپٹر ...

وہ اس پر سوار ہوئے اور تتلی کے اوپر جا پہنچے۔

''اس کاروائی میں ہیلی کاپٹر تباہ نہ ہو جائے ... کیوں نہ ہم پیراشوٹ باندھ لیں۔'' خان رحمان نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔

پھر انھوں نے وہ پھندہ لیا ... اس کے منہ کو کھولا اور نیچے لٹکا نا

شروع کر دیا۔

نیچے ہزار ہا لوگ اس منظر کو حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔

انسپکٹر جمشید پھندے کو تتلی کے بالکل نیچے لے آئے ... تتلی بدستور گھوم رہی تھی ... ادھر وہ پھندے کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہے تھے ... جونہی تتلی پھندے کی زد میں آئی انھوں نے پھندے کو فوراً اوپر کھینچ لیا۔

دوسرے ہی لمحے ان کے چہروں پر حیرت کے بادل نظر آئے ... کیونکہ جال کو آگ لگ گئی تھی اور وہ جلتا ہوا پیچھے جا رہا تھا۔

انسپکٹر جمشید کے ہاتھوں میں اس کی جو رسی تھی اسے بھی آگ لگی ہوئی تھی ... انھوں نے اس کو بھی چھوڑ دیا اور پائلٹ سے بولے۔

"چلیں بھئی ... ہمیں واپس نیچے لے چلیں۔"

ہیلی کاپٹر نیچے آ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے گھڑی دیکھی ... گیارہ بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے ... آخر انھوں نے اسپیکر پر اعلان کیا۔

"نہایت افسوس سے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہم اس تتلی کا کوئی انتظام نہیں کر سکے ... آپ لوگ ٹاور سے جس قدر دور جا سکیں چلے جائیں ... ہمیں نہیں معلوم تباہی کس انداز سے ہوگی کیونکر ہو گی ..."

سب لوگ ٹاور سے اور دور ہٹنے لگے۔

اور پھر وہ خود بھی اپنی گاڑی میں وہاں سے ہٹتے چلے گئے۔

پھر ٹھیک گیارہ بجے ایک پر ہول دھماکا ہوا۔

☆☆☆☆☆

کوئی راستہ نہیں

ٹاور بہت بڑی قوت سے پھٹا تھا۔

اس کے ٹکڑے پہلے اوپر گئے ... پھر بارش کی طرح نیچے آتے نظر آئے ... لوگ اگرچہ پہلے ہی بہت دور ہٹ چکے تھے لیکن اس کے باوجود بے شمار لوگ پھر بھی ان ٹکڑوں کی زد میں آ کر رہے۔

خود ان کی گاڑی پر کئی بھاری پتھر گرے ... اور اگر وہ گاڑی سے باہر اس جگہ موجود ہوتے تو ان سب کا زخمی ہونا لازمی تھا ...

اب وہاں ہر طرف چیخ و پکار شروع ہو چکی تھی ... بے شمار لوگ زخمی ہوئے تھے ... ہر طرف خون بہت نظر آ رہا تھا ... صورتِ حال بہت درد ناک تھی ... انسپکٹر جمشید کے منہ سے کھوئے کھوئے لہجے میں نکلا:

''سب لوگ گاڑی سے اتر جائیں ... اس میں جتنے زخمی لے جا سکتے ہیں ... انھیں لے کر ہسپتال جاتا ہوں۔''

''صدر مملکت تو شاید عہدہ چھوڑنے کا اعلان کر دیں گے کیونکہ وہ اپنی ذات سے دوسروں کو نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔''

''سوال تو یہ ہے کہ کیا ان کے صدارت سے الگ ہو جانے کی

صورت میں پورا ملک اس تتلی سے محفوظ رہ جائے گا ... اور اس صورت میں ملک کا صدر کون ہو گا۔''

'' ظاہر ہے پروفیسر صباری خود صدر بنے گا ... یا ملک میں اپنے کسی پسندیدہ شخص کو صدر بنوائے گا۔''

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ فون صدر مملکت کا تھا۔

'' تم نے دیکھا جمشید ... ہم تتلی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے۔''

''جی ہاں سر!''

'' اس کا پھر فون آیا تھا۔''

'' اوہ!'' وہ دھک سے رہ گئے۔

'' وہ کہہ رہا تھا ... آپ ملک کی جس عمارت کو کہیں اڑا کر دکھا دوں ... آپ کے حق میں بہتر ہے کہ فوری طور پر صدارت چھوڑنے کا اعلان کر دیں ... فی الحال آپ صدارت اپنے مشیر امیر سلطان کے حوالے کر دیں ... اور خود گوشہ نشیں ہو جائیں یا کسی دوسرے ملک چلے جائیں ... اس کے بعد میں جانوں حکومت کے معاملات جانیں ... ہاں ایک بات یہ کہی ہے کہ اگر انسپکٹر جمشید وغیرہ کے ذریعے میرا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی تو پورا ملک تباہی سے دوچار ہو جائے گا ... جونہی پتا چلے گا کہ انسپکٹر جمشید یا انسپکٹر کامران مرزا یا شوکی برادرز اس سلسلے میں حرکت میں آئے ہیں تو میں سب سے پہلے شہر کی سب سے اہم عمارت کو اڑا دوں گا ... ان لوگوں کے لیے بھی بہتر یہی رہے گا کہ ملک

سے نکل جائیں ... اب تم بتاؤ جمشید میں کیا کروں ... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ، میری ذات کی خاطر یہاں لوگ مریں ... اپنے مقابلے میں مجھے عوام کی جانیں زیادہ عزیز ہیں ۔''

صدر صاحب یہاں تک کہہ کر خاموش گئے ۔

وہ سب سکتے کے عالم میں آ گئے ... آخر انسپکٹر جمشید نے کہا ۔

''آپ اپنی کابینہ کا اجلاس بلا لیں ... اور اپنا فیصلہ انھیں سنا دیں ... پھر ہم اکٹھے ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے ۔''

'' ٹھیک ہے ... اب یہی کرنا ہو گا ۔'' صدر مملکت کی آواز آئی ۔

پھر انہوں نے فون رکھ دیا ۔

'' لیکن وہ تو ہمیں یہاں رہنے کی بھی اجازت دے رہا ہے ۔'' پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا ۔

''یہاں ہم زبردست نگرانی میں ہوں گے ... چوبیس گھنٹے ہمیں نظروں میں رکھا جائے گا اور ہماری حیثیت قیدیوں کی ہو گی ۔''

'' تب پھر ۔''

'' ہم سب صدر مملکت سمیت کسی دوست ملک چلتے ہیں ۔''

'' میرا خیال ہے ... ان حالات میں یہ تجویز معقول ترین ہے ۔'' خان رحمان نے کہا ۔

'' بالکل ٹھیک ۔''

اور پھر وہ وہاں سے اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے ۔

سب چپ چپ تھے... وہ سوچ رہے تھے پتا نہیں اب ہمیں اپنے ملک میں پھر آنا نصیب بھی ہے یا نہیں ... حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

دوسری طرف صدرِ مملکت نے اپنی کابینہ کے سامنے تمام حالات کھول ڈالے ... پھر انھوں نے ان سب سے کہا:

"ان حالات میں، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ملک کو کوئی نقصان پہنچے ...اس کا مطالبہ صرف یہی ہے نا کہ میں حکومت سے الگ ہو جاؤں ... سو میں الگ ہو جاتا ہوں۔"

"لیکن جنابِ صدر ...اس کے بعد کیا ہو گا۔" ایک وزیر نے کہا۔

"مجھے یہ تو اندازہ نہیں کہ اس کے بعد کیا ہو گا لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں بدستور صدرات پر جما رہا تو ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا ... اگر آپ لوگ کہتے ہیں تو نہیں جاتا لیکن ٹاور کا حال دیکھ کر اور اس تتلی کا کوئی علاج نہ پاکر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے چلے جانا چاہیے۔"

سب لوگ ان کے خاموش ہونے کے بعد ٹکر ٹکر ان کی طرف دیکھنے لگے ... شاید ان میں سے بھی کسی کو کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

آخر ایک نے کہا۔ "ایک دو اور عمارتوں کی قربانی دے کر دیکھ لیا جائے شاید اس وقت تک ہمارے سراغرساں کچھ کر سکیں۔"

"سرفرازی صاحب! اس صورت میں وہ ایک وقت میں کئی تتلیوں

کو بھیج دے گا ... پھر آپ کیا کریں گے ۔''

سرفرازی صاحب ان کے مشیر تھے۔ صدر صاحب کے اس سوال کا جواب وہ بھی نہ دے سکے۔

''میرا جانا ہی اچھا ہے ... ملک کے لوگ خیریت سے رہیں ، ملک کی املاک محفوظ رہیں ... میرا کیا ہے یہاں بھی دو روٹیاں کھاتا ہوں جہاں جاؤں گا وہاں بھی دو روٹیاں کھا لوں گا ۔''

''لیکن سر اس نے آپ کو یہاں رہنے سے نہیں روکا ... صدرات چھوڑ دینے کے لیے کہا ہے ۔'' وہ بولے ۔

''ہاں لیکن یہاں رہنے کی صورت میں قیدیوں کی طرح رہوں گا ... ہر وقت نگرانی کرائی جائے گی ۔''

آخر کار سب نے نہ چاہتے ہوئے بھی صدر صاحب کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

پھر وہ سب اپنے مختصر ترین سامان کے ساتھ ایر پورٹ پر آگئے ... رخصت ہوتے وقت ان سب کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔

رخصت کرنے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

انسپکٹر جمشید ،محمود ، فاروق، فرزانہ اسوقت بھی اپنا کام کر رہے تھے۔ وہ بغور ان سب کو دیکھ رہے تھے جو صدر صاحب کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان سب ہی کے چہروں کا خوب اچھی طرح جائزہ لینے کا انھیں خوب موقع ملا۔

یہ موقع اس لیے ملا کہ صدر مملکت باعزت طریقے سے رخصت ہو رہے تھے ... کوئی جلدی میں نہیں تھا ... سب سے باری باری ملایا جا رہا تھا ... ایک دوسرے کو رخصتی کے کلمات کہے جا رہے تھے ...

اور اس دوران وہ چاروں سب کی باتیں سن رہے تھے ، انھیں دیکھ رہے تھے۔ ان حالات میں انسپکٹر جمشید اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھ رہے تھے ... اس ملنے ملانے میں دو گھنٹے لگ گئے۔

ملک کے سب ہی لوگ صدر صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور صدر مملکت بھی عوام سے نہ صرف یہ کہ محبت کرتے تھے بلکہ ان کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے بھی تیار تھے ... ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

ان حالات میں بھلا ملنے والوں کا زور شور کیوں نہ ہوتا ...

لیکن آخر کار وہ جہاز میں آ بیٹھے ۔

یہ ایک اسپیشل طیارہ تھا اور اس میں صرف وہ لوگ تھے۔

اچانک پروفیسر داؤد کا رنگ اڑ گیا ...

وہ چلّا اٹھے۔ ''نن ... نہیں ۔''

☆

سب گھبرا گئے ... اس وقت پروفیسر صاحب اٹھ چکے تھے اور بلند آواز میں کہہ رہے تھے: ''جلد از جلد طیارہ خالی کر دو ۔''

وہ باہر کی طرف دوڑ پڑے۔

''رکو نہیں ... دوڑتے رہو۔'' پروفیسر بولے۔

لیکن وہ خود ہی سب سے پیچھے رہ گئے تھے کیونکہ ان کی رفتار بہرحال باقی لوگوں سے کم تھی ... یہ بات محسوس کرتے ہی انسپکٹر جمشید واپس مڑے اور ان کے تک پہنچ گئے ...

''آپ میرے کندھے پر سوار ہو جائیں۔''

''نہیں جمشید ... اب ہم اس حد تک خطرے میں نہیں ہیں۔''

''کیا آپ کے خیال میں جہاز میں بم رکھا گیا تھا۔''

''ہاں بالکل... سو فیصد۔''

عین اس لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا ...

وہ سب اوندھے منہ گرے ... اگر پروفیسر داؤد کو خطرے کا احساس نہ ہوتا تو اس وقت طیارے کے ساتھ وہ بھی ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے ہوتے۔

ادھر ایر پورٹ کا عملہ ان کے گرد جمع ہو چکا تھا ... سب کے رنگ زرد تھے ... ان کے دوڑ پڑنے پر طیارے کا عملہ بھی نکل آیا تھا ... اس طرح ان کے ساتھ وہ لوگ بھی بال بال بچے تھے ... فوج اور ایر پورٹ سیکورٹی فورس نے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا ... مستعد فوجی جوان ان کے گرد گھیرا ڈالے چوکس کھڑے تھے۔

اسی وقت آرمی چیف بھی وہاں پہنچ گئے۔

’’سر ہمیں بہت افسوس ہے ... آپ کے لیے فوجی طیارے کا انتظام کیا جا رہا ہے تا کہ ایسی کسی کارروائی کا امکان ختم ہو جائے ۔‘‘

’’نہیں ۔‘‘انسپکٹر جمشید نے پر زور لہجے میں کہا ۔

’’جی کیا مطلب ... کیا کہنا چاہتے ہیں آپ ۔‘‘

’’ہم فوجی طیارے پر نہیں ... عام طیارے میں جائیں گے ۔‘‘

’’کیا مطلب ... آپ عام طیارے میں جائیں گے ۔‘‘ آرمی چیف نے مارے حیرت کے کہا ۔

’’ہاں ... ہمارا عام طیارے میں جانا ہی مناسب ہے ... فوری طور پر جو بھی پہلی فلائٹ ملک سے باہر جا رہی ہو ... اس میں ...‘‘

سول ایوی ایشن کے چیف کو بلایا گیا ... وہ تباہ شدہ طیارے کا جائزہ لینے وہاں موجود تھا ۔ پوری بات سن کر اس نے کہا :

’’لیکن سر ... جو جہاز اس وقت جانے کیلئے تیار ہے ... وہ وہاں نہیں جا رہا جو آپ کی منزل ہے ۔‘‘

’’آپ اس بات کو چھوڑ دیں ... یہ بتائیں اس میں کتنی جگہ ہے ۔‘‘

’’میں پتا کرتا ہوں ۔‘‘

اب اس نے کسی کو فون کیا ... جلد ہی اس نے بتایا:

’’اس میں بیس سیٹیں خالی ہیں ۔‘‘

’’اچھی بات ہے جمشید ۔‘‘

’’ہم اسی جہاز میں جائیں گے ... جہاں بھی یہ جا رہا ہے ۔‘‘

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔''

''جو کہا ہے وہ کریں ... ہم عام مسافروں کی طرح جائیں گے۔''

''لیکن اس ملک کے ویزے وغیرہ تو آپ کے پاس نہیں ہیں۔''

''وہ ہم کر لیں گے۔''

''جی بہتر!'' اس نے فوراً کہا۔

''اور ایک کام اور کریں۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''وہ کیا سر!''

''اعلان کرا دیں ... صدر مملکت اور ان کے ساتھی جس طیارے میں جانے والے تھے، وہ بم سے تباہ کر دیا گیا ہے ... اب ان کے لیے دوسرے خصوصی طیارے کا انتظام کیا جا رہا ہے ... جب تک انتظام نہیں ہو جاتا، اس وقت تک یہ حضرات لاؤنج میں رہیں گے ... ان کے لیے ایک علیحدہ پورشن قائم کر دیا گیا ہے ... اس پورشن میں کسی عام آدمی کو جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔''

''میں یہ اعلان کرا دیتا ہوں ... لیکن کیا ایسا کیا بھی جائے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ... ہم تو بس اسی طیارے میں جانے والے ہیں نا ... بس یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو جب تک کہ یہ طیارہ اپنی منزل پر نہ پہنچ جائے۔''

''بہت بہتر سر۔''

اور پھر کچھ دیر بعد وہ اس عام طیارے میں سوار ہو چکے تھے ...

پوری کارروائی نہایت خفیہ رکھی گئی تھی ... پہلے ان کو ایک مخصوص لاؤنج میں منتقل کیا گیا اور پھر وہاں ایک خفیہ راستے سے جہاز پر سوار کروا دیا گیا ... وہ بالکل عام لوگوں کی طرح اندر پہنچے ... اس وقت تک ان سب نے اپنے حلیوں میں معمولی تبدیلیاں بھی کر لی تھیں۔

صدر مملکت کا حلیہ بھی بدل دیا گیا تھا ... اب چونکہ ان سب کے بال بچے بھی ساتھ تھے ... اس لیے کسی کو شک بھی نہیں گزرا۔

یہ طیارہ ایک دوست ملک کی طرف پرواز کر رہا تھا ... خوش قسمتی سے اس ملک کے حکمران سے انسپکٹر جمشید کے پرانے تعلقات تھے ... کئی سال پہلے شومٹا والے کیس کیلئے وہ اسی ملک میں آئے تھے ... یہاں کے حکمران ان کے احسان مند بھی تھے ... انسپکٹر جمشید نے روانگی سے پہلے ان سے فون پر رابطہ کر لیا تھا ...

دوست ملک کے سلطان نے ان کا ایر پورٹ پر استقبال کیا۔

ان کا نام سلطان برنانی تھا۔

اس سے پہلے بھی وہ ان سے اس قسم کی مدد لے چکے تھے ... خود صدر برنانی کو ان کی مدد کی کئی بار ضرورت پیش آچکی تھی ... ایک بار تو سازش اس قدر خوفناک تھی کہ صدر بری طرح پھنس گئے تھے ... یہ تو انسپکٹر جمشید تھے جنھوں نے انھیں اس سازش سے اس طرح باہر نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے بال ... ایسے کچھ اور مواقع بھی آئے تھے جب انھیں انسپکٹر جمشید کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اس لیے یہ لوگ ان کے لیے بہت ہی عزیز تھے۔

اور پھر اس بار تو ملک کے صدر ان کے ساتھ تھے ... صدر مملکت سے بھی ان کی پرانی دوستی تھی۔

وہ پیچھے جا رہے تھے ... راستہ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں نے آپ لوگوں کے لیے الگ الگ محل خالی کرایا ہے ... آپ اس میں قیام کریں گے اور اب وہ محل ہمیشہ کے لیے آپ کے لیے مخصوص کر ہو گیا ہے ... آپ کو جب بھی آنا ہو یا کسی مجبوری کی وجہ سے آنا پڑ جائے تو آپ وہیں ٹھہرا کریں گے۔"

"لیکن محترم سلطان، اس محل کو ہمارے وجہ سے خالی رکھنے کی کیا ضرورت ہے ... ہمارا آنا تو کبھی سال دو سال بعد ہوتا ہے ... ہم یوں بھی محلوں کے عادی نہیں ہیں ... عام رہائش گاہوں میں خود کو زیادہ بہتر محسوس کرتے ہیں۔"

"لیکن اس بار تو صدر صاحب بھی آپ کے ساتھ ہیں نا۔"

"آپ کی خواہش ہے تو کر لیتے ہیں بلکہ آئندہ بھی جب ہمیں آنا پڑا ہم اس میں ٹھہر جایا کریں گے لیکن اسے بلا وجہ خالی نہ رکھیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ورنہ وہاں جن بھوت ڈیرہ جما لیں گے۔" فاروق بول پڑا۔

اور وہ سب مسکرا دیے۔

"شکر ہے تمھاری بھی آواز سنائی دی ورنہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے

آج تم نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال لی ہیں۔'' فرزانہ پٹ سے بولی ۔

'' گھنگھنیاں کیا ؟'' سلطان نے حیران ہو کر پوچھا ۔

'' جی وہ ہوتی ہیں ہماری طرف ایک چیز ۔'' فاروق گڑبڑا گیا۔

'' کھانے کی چیز ہوتی ہے ؟'' سلطان برنانی نے پوچھا ۔

'' جی ... جی ہاں ۔''

'' میں بھی کھا کر دیکھوں گا کہ وہ کیا چیز ہے جسے منہ میں ڈال کر آدمی بول نہیں سکتا۔''

'' وہ کیوں انکل سلطان ۔'' محمود نے فوراً کہا ۔

'' اپنی بیگم کے منہ میں دے دیا کروں گا۔''

اس پر سب ہنس پڑے ۔

'' کیا وہ بہت ... مگر نہیں ہم یہ نہیں پوچھ سکتے ۔''

'' بہت تو نہیں لیکن بہرحال ہیں تو عورت اور عورتیں زیادہ باتیں کرنے کی عادی تو ہوتی ہی ہیں۔''

'' انکل آپ کو پتا ہے گھنگھنیاں کیا چیز ہیں۔'' محمود نے بے چارگی کے عالم میں خان رحمان کی طرف دیکھا ۔

'' بھئی اپنی آنٹی سے پوچھو نا ... یہ شعبہ ان کا ہے۔'' خان رحمان نے بوکھلا کر کہا ۔

''لگتا ہے آپ لوگوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں بس محاورے کے طور پر یہ جملہ بولتے رہے ہیں۔'' میزبان سلطان مسکرائے۔

''صورتحال کچھ ایسی ہی ہے لیکن میں بتا سکتا ہوں۔'' پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

''یعنی آپ کو معلوم ہے گھنگھنیاں کیا چیز ہوتی ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں ... گندم کو ابال کر اس میں چینی ڈالی جاتی ہے ... بس اسے گھنگھنیاں کہتے ہیں اور جب یہ منہ میں ہوں تو آدمی بول نہیں سکتا کیونکہ منہ سے باہر پھسل پڑیں گی۔''

''دھت تیرے کی ... پروفیسر انکل سب سے بازی لے گئے۔''

''کس چیز میں۔'' فاروق نے فوراً کہا۔

''گھنگھنیوں میں اور کس چیز میں۔''

''اور ہم محل پہنچ گئے۔'' میزبان سلطان نے اشارے سے بتایا۔

انھوں نے دیکھا، ان کے سامنے ایک شان دار محل تھا۔

ایسا محل جس کا ذکر کبھی وہ پریوں وغیرہ کی کہانیوں میں پڑھا کرتے تھے ... اب جو وہ اس میں داخل ہوئے تو دھک سے رہ گئے ...

وہ محل تو خوابوں میں دیکھی جانے والی خوب صورت جگہوں سے بھی زیادہ خوب صورت تھا ... شائنا کی طرز پر بنایا گیا ایک محل ...

پرانے زمانے کے بادشاہوں کے محلوں سے بھی بڑھ کر خوبصورت تھا۔ مغلیہ دور کی یاد تازہ کرتا نظر آیا تھا۔ باغ کے درمیان میں فوارے چل رہے تھے۔ فواروں کے دونوں طرف پودے اور درخت انتہائی خوبصورت تھے۔

وہ روش پر چلتے آگے بڑھے تو سنگ مرمر کی عمارت نظر آئی۔
یہ عمارت تاج محل کی یاد تازہ کر رہی تھی ... کمروں میں گئے تو وہ بہت بڑے نظر آئے ... ان میں جدید دور کی تمام سہولتیں موجود تھیں ...

''بہت ہی نفیس اور بہت ہی شاندار۔'' صدر مملکت بولے۔

''مجھ سے ملنا ہو تو موبائل فون پر رابطہ کریں میں آجاؤں گا۔'' سلطان برنانی نے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ!''

'' آپ میرے محسن ہیں اور صدر صاحب تو میرے دوست ہیں۔''

اور سلطان برنانی ان سے رخصت ہو گئے ...

اب وہ فواروں کے پاس آ بیٹھے کیونکہ یوں تو پورا محل ہی بہت دلکش تھا لیکن سب سے خوب صورت نظارہ ان فواروں کا تھا جو مختلف انداز میں اچھل رہے تھے۔ ہر فوارے کا اپنا الگ انداز تھا ... اور ان پر اڑنے والے پرندوں نے اس منظر میں اور زیادہ حسن پیدا کر دیا تھا۔

جونہی وہ آ کر وہاں بیٹھے، خادم میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں رکھنے لگے۔

''یہ کیا، ہم نے تو ابھی آپ سے کچھ بھی نہیں کہا۔'' خان رحمان نے حیران رہ گئے

'' ہمارا رواج ہے سر ... کہ جب یہاں آ کر بیٹھتے ہیں تو ان ہلکی پھلکی چیزوں سے شوق کرتے ہیں۔'' ایک خادم نے باادب ہو کر کہا۔

اب جو انھوں نے ان چیزوں کو چکھا تو بہت ہی الگ الگ ذائقے محسوس ہوئے، انھیں مزہ آنے لگا اور وہ ان چیزوں کو کھاتے چلے گئے۔

ایسے میں انسپکٹر جمشید کی آواز انھیں چونکا دیا۔

''ہم تفریح کیلئے نہیں آئے ... فوری طور پر کام شروع کرنا ہے۔''

''اوہ جی ہاں ہم تو ان رنگین نظاروں میں بھول ہی گئے تھے کہ ہم کن حالات کا شکار ہیں۔''

''سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ... پروفیسر صباری کو صدر صاحب کا موبائل نمبر کس نے دیا کیونکہ یہ نمبر صدر صاحب کا صرف چند خاص آدمیوں کو معلوم ہے۔''

''یہ بات تو بہت اہم ہے ... یہ نمبر تو بہت ہی کم یعنی گنتی کے لوگوں کو پتا تھا...'' صدر مملکت چونک اٹھے۔

☆☆☆☆☆

سوچ کا سمندر

''پھر بتائیے کہ کس کس شخص کو آپ کا خاص نمبر معلوم ہے۔''

انہوں نے صدر مملکت کی طرف دیکھا... پھر محمود سے بولے:

''نوٹ کرو... نام کے آگے ان کا عہدہ بھی لکھنا۔''

''جی بہتر۔'' محمود فوراً بولا۔

''لیکن جمشید... اب کیا فائدہ۔''

''سر... ابھی تو ہمارا کام شروع ہوا ہے... اس سے پہلے تو ہم اس کے ہاتھوں مجبور ہو چکے تھے... اپنے ملک میں رہ کر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے، اب ہم کھل کر کام کریں گے آپ نام بتائیں کیونکہ پروفیسر صباری کو آپ کا نمبر دینے والا شخص ہی ہم کو سازش کی بنیاد تک پہنچا سکتا ہے۔''

''آخر ہم یہاں رہ کر کیا کر لیں گے۔''

''اس سوال کا جواب ہم آپ کو بعد میں دیں گے۔''

عین اسی وقت میزبان سلطان برنانی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے... ان کا سانس پھول رہا تھا۔

نزدیک آتے ہی انہوں نے کہا: ''آپ کے ملک میں نئی حکومت قائم ہو گئی ہے ... ملک کے نئے صدر کا اعلان کر دیا گیا ہے اور یہ اعلان پروفیسر صباری نے کیا ہے۔''

''مطلب یہ کہ پروفیسر صباری تو کسی کے سامنے نہیں آئے گا اور اپنے پسندیدہ آدمیوں سے حکومت کرائے گا ... ملک کا نیا صدر اس کے احکامات کے مطابق چلے گا۔'' صدر مملکت بولے

''ہوں ... مجھے اسی بات کا ڈر تھا ... نئے صدر کا نام کیا ہے۔''

''وجاہت میر سرفرازی کو نیا صدر بنایا گیا ہے۔''

''کیا !!!'' صدر صاحب چلّائے۔

''اور آپ کا خاص نمبر ظاہر ہے سرفرازی کے پاس بھی ہو گا۔''

''ہاں جمشید ... لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''پروفیسر صباری کو جان بوجھ کر پروفیسر شنکی چانگ کا نائب بنوایا گیا تھا ... اس کی ڈیوٹی یہ لگائی گئی تھی کہ شنکی چانگ کے تجربات پر نظر رکھے، اس کی ایجادات کی ٹوہ میں رہے ... جونہی اس نے تتلی ایجاد کی، اس نے اپنے آقاؤں کو خبردار کر دیا ... اس طرح اس ایجاد کو اڑا لیا گیا ... شنکی چانگ کو اغوا کر لیا گیا تاکہ ہم ان لوگوں کے خلاف اس سے کوئی مدد نہ لے سکیں ... اب ظاہر ہے اس سازش میں جو لوگ شریک تھے صدر بھی انھیں میں سے بننا تھا ... وجاہت میر سرفرازی کو بھی اسی سازش کے تحت آپ کا مشیر بنوایا گیا تھا، ایسے کام یہ لوگ بہت غیر

محسوس طور پر کرتے ہیں۔''

''کون لوگ!'' صدر صاحب نے فوراً کہا۔

''ممکنہ طور پر انشارجہ اور بیگال اور شارجستان ... آج کل یہ ممالک شائنا کے ذریعے بننے والی سڑک سے پریشان ہیں ... اگر یہ سڑک شروع ہوگئی تو ان تینوں کو بہت نقصان پہنچے گا۔''

''یعنی یہ صباری اور وجاہت میر سرفرازی انشارجہ اور بیگال کے کارندے ہیں۔''

''پوری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ انشارجہ بیگال سے کام لیتا ہے جب کہ اصل حکمرانی بیگال کی ہے ... ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ انشارجہ ہمارا دوست ہے لیکن یہ بات کوئی نہیں سمجھتا اور جو دوست ہو سکتا ہے ہم اس کا رخ بھی نہیں کرتے ... میرا اشارہ شائنا کی طرف ہے، اگرچہ شائنا مسلمان ملک نہیں لیکن ہمارے لیے انشارجہ برٹائن اور بھارت سے لاکھ درجے بہتر ہے ... ہم لوگ اگر اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ مل جائیں اور شائنا سے تعلقات قائم کر لیں تو انشارجہ اور بیگال کی مسلسل سازشوں سے بچ سکتے ہیں لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو پھر ہرگز نہیں بچ سکیں گے اور سر! میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے کئی بار رکھی ہیں لیکن آپ کے مشیر آپ کو میری باتوں پر غور کرنے ہی نہیں دیتے۔''

''ہاں جمشید یہی ہو رہا تھا۔'' انھوں نے سر ہلایا۔

''اور اسی لیے آج آپ یہاں بیٹھے ہیں اور انھوں نے اپنے

منصوبے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔''

''نجانے ملک کے حالات کیا ہوں گے۔'' فاروق نے آہ بھری۔

کیوں نہ اپنے ملک کی خبریں بھی سنتے رہیں۔'' محمود نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

اور وہ ٹی وی میں روم میں آ گئے۔

خادم نے ٹی وی آن کر دیا ... اس میں انہی کے ملک کی خبریں چل رہی تھیں ... اس وقت خبریں نشر ہو رہی تھیں :

'' ملک میں وجاہت میر سرفرازی کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ وہ اپنی کابینہ منتخب کر چکے ہیں ... ان کی کابینہ ارکان کے ارکان کے نام یہ ہیں۔اب وہ ان لوگوں کے نام لے رہا تھا۔

وہ ناموں کو غور سے سنتے رہے ... بلکہ محمود تو نام لکھتا جا رہا تھا ... آخر یہ سلسلہ ختم ہوا ... تب صدر صاحب نے کہا :

''یہ سب کے سب لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ انشارجہ کا دم بھرتے نظر آتے رہے۔''

'' کیا ان حالات میں یہ لوگ انسپکٹر کامران مرزا کو ملک میں رہنے دیں گے ۔'' صدر مملکت نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

'' جی نہیں ... وہ پہلی فرصت میں انھیں گرفتار کرنے کا حکم دیں گے یا پھر انھیں بھی ہماری طرح ملک بدر کر دیا جائے گا ... ان حالات میں وہ بھی بہت جلد یہاں ہوں گے ۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

اس وقت ان کے موبائل کی گھنٹی بجی ... انھوں نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا ... انسپکٹر کامران مرزا کا نام نظر آیا۔

''لیجیے ... شاید وہ پہنچ گئے۔'' وہ مسکرائے۔

''کون ؟ کامران مرزا !!!''

''یس سر۔''

یہ کہتے ہی انھوں نے بٹن دبایا تو دوسری طرف سے فوراً ہی ان کی آواز سنائی دی۔ ''آپ سلطان برنائی کے مہمان ہیں نا۔''

''بالکل ... اور آپ کہاں ہیں۔''

''ایر پورٹ پر ... شوکی برادرز بھی ساتھ ہیں۔''

''وہیں ٹھہریں ... ابھی سلطان برنائی ہدایات دیتے ہیں۔''

موبائل بند کر کے انھوں نے صدر برنائی کو صورت حال بتائی۔

''اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ اپنے عملے کو ہدایات دینے لگے ... آخر فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

''وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''یہ اچھا ہوا ... ہم ایک جگہ جمع ہو گئے۔''

''مطلب یہ کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے کئی۔'' فاروق نے گنگنا کر کہا۔

آخر انھوں نے بہت سے قدموں کی آواز سنی۔ نظریں اٹھائیں تو

انسپکٹر کامران مرزا پارٹی اور شوکی برادرز چلے آ رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے ... باعزت طور پر آپ لوگ بھی نکلے۔'' فاروق بول اٹھا۔

''کچھ اپنی کہو ...'' آفتاب جل گیا۔

''ہم باعزت طریقے سے خود ہی آئے لیکن اپنی مرضی سے۔''

''سنا آپ سب نے۔'' آصف منمنایا۔

''بالکل نہیں۔'' شوکی نے فوراً کہا۔

''بھئی خبردار ابھی آیندہ کا پروگرام طے کرنا ہے ... اس وقت تم لوگوں کی نوک جھونک کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''گنجائش کی بھی ایک ہی کہی انکل ... وہ ہم نکالنے کو تیار ہیں۔'' فاروق مسکرایا۔

اور وہ سب مسکرانے لگے۔

''میں نے کہا ... پہلے حالات۔''

''جی اچھا۔'' سب ایک ساتھ بولے۔

اب انسپکٹر جمشید نے شروع سے تمام حالات سنائے۔

انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے تو انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

''پھر اب کیا ہو گا۔''

''یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا ... یہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجاہت سرفرازی کو پہلے صدر صاحب کا مشیر بنوا لیا گیا تھا تاکہ کامیابی

کی صورت بنتے ہی وہ صدارت اسے سونپ دیں۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے۔"

"پروفیسر صباری کا سراغ لگانا ہوگا، ان تتلیوں تک پہنچنا ہوگا۔"

"پروفیسر صباری کا سراغ کیسے لگائیں ... ہم تو ملک میں داخل ہو نہیں سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"اور میں فرزانہ اور فرحت کو یہ سوچنے کے لیے آواز دیتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آواز دینے کی کیا ضرورت ہے انکل ... ہم تو یہیں موجود ہیں۔" فرحت مسکرائی۔

"عقل سے پیدل ... انکل کا مطلب ہے تم دونوں کی عقل کو آواز دیتا ہوں۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"ہائیں تم نے مجھے عقل سے پیدل کہا۔" فرحت نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"تو اور کیا عقل سے گھوڑے پر سوار کہوں۔" آفتاب مسکرایا۔

"آپ سن رہے ہیں انکلز۔" فرحت نے سب پر ایک نظر دوڑائی۔

"بالکل سن رہے ہیں ...کیوں نہ سنیں۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

"لیجیے آپ بھی ہمارے رنگ میں رنگے گئے۔"

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہی ہے۔"

"اس وقت ضرورت ہے ہمیں ایک عدد ترکیب کی ... ایسی ترکیب

کی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ... میں نے فرزانہ اور فرحت کی عقلوں کو آواز دی ہے لیکن ہم سب بھی غور کرتے ہیں ... یہ دونوں بھی غور کریں ... دیکھتے ہیں کس کی ترکیب بازی لے جاتی ہے۔"

"تو پھر یہ لیں ... ہم ابھی سوچ کے سمندر میں اتر جاتے ہیں۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"لیکن اس قدر گہرائی میں نہ چلے جانا کہ پھر تمھاری تلاش میں ہمیں نکلنا پڑے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"ہم خیال رکھیں گے اور مناسب گہرائی تک جائیں گے۔" آفتاب مسکرا دیا۔ اور پھر سب سوچ میں گم ہو گئے۔

کتنی ہی دیر گزر گئی لیکن کسی نے سر نہ اٹھایا نہ کوئی بات کی۔

سلطان برنائی اس دوران واپس جا چکے تھے۔

"کہیں تم لوگ واقعی سوچ کے سمندر میں تو نہیں اتر گئے اور بہت زیادہ گہرائی میں تو نہیں چلے گئے۔" خان رحمان بولے۔

"اوہو انکل یہ کیا کہا آپ نے ... ترکیب ہاتھ سے نکل گئی۔" فرزانہ نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"کک ... کیا واقعی۔"

"کوئی بات نہیں ... ہم ایک بار پھر غوطہ لگا لیتے ہیں۔"

آخر کوئی ایک گھنٹے بعد فرزانہ نے سر اوپر اٹھایا اور بغیر کسی جوش کے کہا: "میں کوئی ترکیب نہیں بتا رہی ... کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں فرزانہ پوچھو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً کہا۔

"اس قسم کے حالات ہمیں پہلے بھی کئی بار پیش آچکے ہیں ... ہم پہلے بھی ان حالات میں سلطان برنائی صاحب کی خدمات حاصل کر چکے ہیں۔ اب تک ہوتا یہ آیا ہے کہ ہم یہاں آکر اپنے یہاں کے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات تیار کراتے ہیں اور پھر اپنے ملک چلے جاتے ہیں ... کیا اب تک ہماری اس ترکیب کا دشمنوں کو پتا نہیں چلا ہے۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"فرض کر لیتے ہیں انھیں پتا چل چکا ہے تو کیا اس بار انھوں نے اس کا توڑ نہیں کیا ہو گا۔"

"فرزانہ کی اس بات میں وزن ہے۔"

"بڑی مصیبت ہے ... فرزانہ کی باتوں میں وزن نکل آتا ہے۔"

"چلو وزن ہی نکل آیا ہے ... کوئی شیر یا چیتا تو نہیں نکل آیا۔" آفتاب مسکرایا۔

عین اس لمحے انھوں نے ایک بار پھر سلطان برنائی کو واپس آتے دیکھا ... حالانکہ انہیں گئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے۔

ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری تھے۔

☆☆☆☆☆

راستے بند

''لگتا ہے ہمارے میزبان نے کوئی بری خبر سنی ہے۔''
انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔
اتنے میں سلطان برنائی نزدیک آگئے۔
''آپ لوگوں کے ملک میں داخل ہونے کے تمام راستے روک دیے گئے ہیں۔''
''اوہ!!''
''میرے ملک کی وہ تمام پروازیں جو آپ کے ملک جاتی تھیں بند کردی گئی ہیں اور آپ کے ملک سے جو پروازیں آتی تھیں وہ بھی نہیں آئیں گی۔''
''لیکن یہ خبر تو ہمارے لیے بالکل بھی پریشانی والی نہیں ہے۔''
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
''وہ کیسے۔'' انھوں نے بھی مسکرا کر کہا۔
''ہم یہاں سے کسی بھی ملک چلے جائیں گے اور اس ملک کے کسی جہاز سے ملک پہنچ جائیں گے۔''

" ایسا نہیں ہے۔"

" کیا مطلب ؟ "

" اسے معلوم ہے کہ آپ لوگ میرے پاس ہیں لہٰذا اس نے دھمکی دی ہے کہ سلطان برنائی کے ملک سے کوئی پرواز کسی ملک کو گئی تو وہ اس ملک میں تتلیاں بھیج دے گا۔"

" آپ کا مطلب اس ملک سے ہے یا ہمارے ملک سے۔"

" میرے ملک میں تتلیاں بھیج دے گا ... مطلب یہ کہ میرے ملک سے کوئی جہاز کسی بھی ملک کو نہیں جائے گا۔"

" ہوں ... مطلب یہ کہ آپ کے ملک کا تعلق کسی بھی ملک سے ختم کر دیا گیا ہے۔"

" اور انسپکٹر جمشید ... اس صورت میں ہم بہت بڑی مصیبتوں میں گھر جائیں گے۔"

" آپ کے پاس پوری دنیا کے نقشے تو ہوں گے ... میرا مطلب ہے ہر لحاظ سے تیار کیے گئے نقشے۔"

" وہ موجود ہیں۔"

" بس آپ ہمیں وہ نقشے بھجوا دیں۔"

" میں ابھی بھجوا دیتا ہوں لیکن آپ کیلئے ایک اور بری خبر ہے۔"

" لگتا ہے ... آج کا دن بری خبروں کا دن ہے۔"

" شاید ... بہرحال خبر یہ ہے کہ آپ کے ملک کے دارالحکومت کے

ایک علاقے کے لوگوں کو کھلم کھلا اعلان کیا تھا کہ وہ اس تتلی حکومت کو نہیں مانتے ... جو کرنا ہے کرلو بس ... اس نے ایک تتلی ادھر بھیج دی اور وہ پورا علاقہ جل کر راکھ ہو گیا ... تتلی اس علاقے پر بجلی کی طرح گری بم کی طرح پھٹی اور پھر وہاں آگ لگ گئی ... فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو اس طرف جانے ہی نہیں دیا گیا۔''

''یہ خبر واقعی خوفناک ہے اور دردناک ہے۔''انسپکٹر جمشید کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا، ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لوگوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی جس کے نتیجے میں انھیں جلا دیا گیا ...

''اور اس واقعے کے بعد تو پورے ملک میں کوئی چوں بھی نہیں آئے گی۔''

''جی ہاں سب نے چپ سادھ لی ہے۔''

''اور انھیں چپ ہی سادھ لینی چاہیے، ہم بھی تو آخر نکل آئے ہیں۔'' خان رحمان نے کہا۔

سلطان برنائی نے جلد ہی انھیں دنیا کے نقشے مہیا کر دیے۔

اب وہ کمرے کے فرش پر بیٹھ گئے اور نظریں ایک نقشے پر جما دیں ... یہ نقشہ زمینی راستوں سے متعلق تھا اور انھیں اس کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ انھیں بحری راستوں والے نقشے کو بھی دیکھنا تھا۔

ان کے پاس اب دو ہی راستے تھے ... خشکی کا اور سمندر کا ... فضائی راستے تو ان کے لیے تمام بند کر دیے گئے تھے ...

'' معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم سے بہت خوفزدہ ہیں۔'' فاروق بولا۔

''ہاں بالکل، وہ سمجھتا ہے کہ ہم اس تک پہنچنے کی ہر کوشش کریں گے، چاہے ہماری جانیں چلی جائیں ہم اپنی کوشش سے باز نہیں آئیں گے ... وہ ہمیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔''

'' تب پھر وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ اب ہم خشکی اور سمندر کے راستے کوشش کریں گے۔''

''ہاں لیکن خشکی اور سمندر کے راستے یا کم نہیں ہوتے کہ ہر جگہ کی نگرانی کی جا سکے... جبکہ ایر پورٹوں کی نگرانی آسانی سے ہوسکتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

وہ نقشوں میں گم ہو گئے۔ ان پر نشانات لگاتے رہے۔ نوٹ بک میں نوٹ کرتے رہے۔ اس طرح رات ہوگئی اور اس بات کا احساس انھیں اس وقت ہوا جب سلطان برنائی نے آ کر کہا۔

'' کھانا تیار ہے صاحبان۔''

'' اوہ لیکن آپ خود کو تکلیف کرتے ہیں، خادم کو بھیج دیا کریں۔''

'' نہیں ... آپ لوگوں کی خدمت خود کروں تو زیادہ مزہ آتا ہے۔''

'' پھر تو مجبوری ہے۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔

سلطان برنائی نے کھانے میں بہت تکلف سے کام لیا تھا ... کئی طرح کے کھانے تیار کرائے تھے اور بہت زیادہ نفیس قسم کے کھانے بنوائے تھے... جب وہ دستر خوان پر پہنچے تو حیرت زدہ رہ گئے۔

پورا کمرہ کھانوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

''یہ کیا سلطان ... اتنے کھانے اتنا تکلف۔'' صدر صاحب نے گھبرا کر کہا۔

''جب میں آپ کے ملک میں آؤں گا تو آپ س بھی بڑھ چڑھ کر کھانے تیار کرا لیجیے گا۔''

''یہ ایک ایسا جواب ہے جس کے بعد انسان کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' صدر صاحب نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

''بس تو پھر مجبوری ہے ... ان کھانوں کے ساتھ انصاف کرنا پڑے گا۔'' پروفیسر جلدی سے بولے۔

آخر کھانا شروع ہوا۔ سلطان برنائی بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک تھے ... کھانوں میں عربی کھانے بھی تھے اور ان کے ملک کے بھی ... غرض دونوں طرح کے کھانے اپنا جواب آپ تھے ... دستر خوان پر زیادہ تر پرندوں کا گوشت موجود تھا ... ایک ڈش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان نے کہا۔

''لل ... لیکن ...'' ایسے میں پروفیسر داؤد بول اٹھے: ''اس طرف ایک ڈونگے میں ایک سالن ہے ... اس میں گوشت نہیں ہے لیکن یہ بہت ہی مزیدار ہے ... آخر یہ کیا ہے۔''

سلطان برنائی نے اس ڈونگے کو دیکھا ... اس سالن میں سے ایک لقمہ لیا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیے۔

"خیر تو ہے سلطان ... آپ مسکرا رہے ہیں۔"

"میں اس لیے مسکرا رہا ہوں کہ جو سالن آپ کو اتنا پسند آیا ہے وہ میرے بچپن کا پسندیدہ کھانا ہے ... یہ سالن میری والدہ تیار کرتی تھیں۔ اس زمانے میں میرے والد فوج میں تھے لیکن ان کا عہدہ کوئی خاص بڑا نہیں تھا ...جب گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو میری والدہ یہ سالن تیار کر دیتی تھیں کیونکہ اس سالن کو تیار کرنے کے لیے انھیں بازار سے کوئی خاص چیزیں نہیں منگوانی پڑی تھی ... دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھانا غربت کے دنوں کا کھانا تھا۔ میں اس سالن کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں ، اسے ضرور بنواتا ہوں اور اپنی والدہ ... والد اور غربت کے دنوں کو یاد رکھتا ہوں ... اس سالن میں صرف پیاز ، ہری مرچ ، سفید زیرہ اور گھی ہے ... یعنی گھی میں ان چیزوں کو توے پر تلا گیا ہے اور بس۔"

"حیرت ہے ... اس قدر سادہ اور تیار کرنے میں آسان کھانا ... اور اس قدر مزے دار۔"

"ابھی تو یہ اتنا مزے دار نہیں ہے جتنا میری والدہ تیار کرتی تھیں ... پتا نہیں وہ اس سادہ ترین کھانے میں بھی کیا ترکیب لڑاتی تھیں کہ وہ مزہ پھر نہ مل سکا ... لیکن اب بھی یہ بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اس میں شک نہیں۔"

اور پھر دستر خوان پر ہرن اور مرغابی کے گوشت سے پہلے وہ سادہ

سالن ختم ہوا ... کھانے سے فارغ ہو کر انسپکٹر جمشید نے کہا :

'' اور پروفیسر صاحب ! آپ کو ابھی ایک تجربہ بھی کرنا ہے ... میرا مطلب ہے یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے ۔''

'' کیسا تجربہ جمشید ۔''

'' اس عجوبے کا تعلق دھاتوں سے ہے ۔''

'' دھاتوں سے ... شاید میں دھاتوں کا اتنا ماہر نہیں ... دھاتوں کے ماہر تو ڈاکٹر قدیر ہیں ۔''

'' طالب علمی کے زمانے میں ، میں بھی کچھ عرصہ ڈاکٹر قدیر کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر چکا ہوں ... میں آپ کو مشورہ دیتا رہوں گا ... اللہ نے چاہا تو ہم اس تجربے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔''

'' اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے ۔''

اسی دن انھوں نے ایک کاغذ پر چند دھاتوں ، اور کیمیکلز کے نام لکھ کر سلطان کو دیے ... جلد ہی وہ چیزیں آ گئیں ...

اب انھوں نے باقی ساتھیوں سے کہا :

'' پروفیسر صاحب اور ہم تو ذرا اپنا تجربہ مکمل کریں گے ... آپ لوگوں کو اس وقت تک کھلی چھٹی ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائے بھی

'' ہم سمجھ گئے ... آپ ہمیں باتوں کی جنگ لڑنے کی کھلی چھٹی دے رہے ہیں ۔'' فاروق چونکا ۔

'' بلکہ تم اس میں محاورات اور ضرب الامثال کے تیر ، نیزے اور

بھالے بھی استعمال کر سکتے ہو۔''

'' ارے باپ رے آپ تو ہمیں خوفناک اور خطرناک چھٹی دے رہے ہیں۔'' آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

بڑی پارٹی مسکراتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی ...

ان کے جانے کے بعد فاروق بول اٹھا: ''رہ گئے ہم۔''

'' اب ہم رہیں بھی نہ۔'' آفتاب نے منہ بنایا۔

'' لڑنے کی موڈ میں تو نہیں ہو۔'' فاروق نے اسے گھورا۔

'' لڑنے کی ضرورت پیش آئی تو میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔'' آفتاب تنک کر بولا۔

'' لگتا ہے انگارے چباتے رہے وہ۔'' فاروق نے اسے گھورا۔

'' تمھیں کس نے روکا ہے ... تم بھی چبا لیا کرو۔''

'' تمھارا سچ مچ تو لڑنے کا ارادہ نہیں ... یہ تو سوچو کہ ہمارے میزبان کیا سوچیں گے۔'' محمود نے گھبرا کر کہا۔

'' کہیں گے کیا ... ہماری جنگ سے لطف اندوز ہوں گے۔''

'' بلوا لو پھر انھیں بھی۔''

'' ان کی موجودگی میں ہم کھل کر بات نہیں کر سکیں گے۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

'' کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' فرحت نے کہا۔

'' اور یہ کھلی چھٹی سے ہم اصل فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔'' ایسے

میں شوکی کی آواز سنائی دی۔

''اصلی فائدہ ... کیا مطلب؟'' آصف اس کی طرف مڑا۔

''یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ اصلی فائدے کا مطلب اصل فائدہ ہی ہوتا ہے۔''

''توبہ ہے تم سے۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔

''لگتا ہے ہم لوگ نہ کوئی کام کی بات کر سکیں گے اور نہ باتیں ہی کر سکیں گے کیونکہ سب نے جلا کٹا انداز اپنا لیا ہے۔''اشفاق نے خود بھی جلے کٹے انداز میں کہا۔

''پھر اچھا طریقہ یہ ہے کہ جلے کٹے انداز کو کھلی چھٹی دے دیں یعنی اسے رخصت کر دیا جائے ... خوشگواری خود بخود چلی آئے گی۔''

''ایسا کر لیتے ہیں، ہمارا کیا جاتا ہے۔''

''پہلے ذرا تتلی والے معاملے پر کیوں نہ بات کر لی جائے۔'' شوکی کی آواز ابھری۔

''اس پر تو بات ہو چکی۔''آفتاب نے منہ بنایا۔

''بڑوں نے اپنے انداز میں بات کی ... ہم اپنے انداز میں بات کریں گے۔''فاروق بولا۔

''تتلی والے معاملے پر بات کرنا زیادہ اچھا ہے ... آخر ہم جو یہاں موجود ہیں، اس کیس کے سلسلے میں موجود ہیں، درمیان میں آپ کی بات چیت بھی ہوتی رہے گی۔'' فرزانہ پر زور انداز میں بولی۔

''اچھی بات ہے یونہی سہی ... ہاں تو بات کہاں سے شروع کی جائے۔'' آصف نے فوراً کہا۔

''ظاہر ہے تتلی پر بات تتلی سے ہی شروع ہوسکتی ہے۔'' محمود مسکرایا

''توبہ ہے تم سے۔'' فرحت نے اسے گھورا۔

''اس سازش کا تعلق وجاہت میر سرفرازی کا ہے۔'' آصف بولا۔

''یہ تو سب کو معلوم ہے ... کام کی بات کرو۔'' محمود نے منہ بنایا۔

''یہ کیس مشینی مخلوق جیسا ہے ... اس میں ایک مکھی نے ہمیں پریشان کیا تھا ... اب مکھی کی جگہ تتلی نے لے لی ہے۔''

''اس مکھی کا انداز اور تھا ... وہ لکڑی یا لوہے میں سوراخ کر کے اندر داخل ہو جاتی تھی اور فائلوں وغیرہ کو جلا دیتی تھی ... یہاں معاملہ اور ہے ... شہر کی بڑی عمارت اس تتلی کے ذریعے تباہ کی جاسکتی ہیں اور معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے لہٰذا ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ... یا تو ہم کسی طرح پروفیسر صباری تک پہنچ جائیں یا اس تتلی کو تباہ کرنے کا طریقہ جان لیں۔''

''اور ہمارے بڑے شاید یہی کرنے کے لیے گئے ہیں ... غالباً ان کی توجہ تتلی کی تباہی کی طرف ہے۔'' شوکی مسکرایا۔

''تتلی کی تباہی کا فائدہ ہم اس صورت میں اٹھا سکتے ہیں جب ان کے ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں ورنہ وہ تو تتلی کو کبھی بھی کہیں بھی بھیج سکتا ہے جب کہ ہم تتلی کو نشانہ بنانے کے بعد ہر جگہ فوراً تو نہیں پہنچ سکتے۔''

آصف کہتا چلا گیا ۔

''تتلی کو ناکام بنانے کے لیے ہمارے پاس حربہ ہونا چاہیے ۔'' محمود نے پرزور لہجے میں کہا ۔

'' میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری اصل ضرورت اس کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنا ہے اور ہم اپنے ملک میں نہیں ہیں ... ملک میں ہوتے ہوئے بھی ہیڈ کوارٹر تلاش کرنا آسان نہیں تھا ... اب تو اور زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ مشکل ہے ۔''

'' اور ہم شاید آسان کاموں کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے ۔'' فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا ۔

ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں ۔

'' جہاں تک میرا اندازہ ہے ... اب ہمیں اپنا سفر سمندروں اور جنگلوں کے ذریعہ کرنا ہو گا ۔''

''ظاہر ہے ... فضائی راستے تو سب طرف بند ہیں ۔''

'' ہیڈ کوارٹر کا سراغ لگانا جان جوکھوں کا کام ہو گا ۔'' اخلاق نے پہلی بار منہ کھولا ۔

''لیکن ہمیں بہرحال سراغ لگانا ہوگا ورنہ ہمارا پورا ملک ان کے قبضے میں چلا جائے گا ۔'' آصف کی آواز ابھری ۔

'' اس میں ایک عجیب ترین بات میرے ذہن میں آتی ہے ۔'' فرزانہ نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے کہا ۔

''اللہ کا شکر ہے ... جلدی بتاؤ۔''

''پروفیسر شنکی چانگ کب سے ہمارے ملک میں رہ رہے تھے اور تجربات کر رہے تھے ... سوال یہ ہے کہ اگر وہ اپنے طور پر تجربات کر رہے تھے تو حکومت نے انھیں اجازت کیسے دی، اگر اجازت دی تھی تو ان کی تجربہ گاہ کی حفاظت کو کوئی انتظام کیوں نہیں کیا تھا، کیوں نہ ہم صدر صاحب کے پاس چلیں ... وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہوں گے۔'' فرزانہ کہتی چلی گئی۔

''ٹھیک ہے آؤ۔'' محمود نے پر جوش انداز میں کہا۔

اور پھر وہ صدر صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

محمود نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ...

اندر کمرے میں سے ایک آواز ابھری۔

☆☆☆☆☆

خفیہ فورس

"آ جاؤ بچوں ... دروازہ کھلا ہے۔"

وہ بہت حیران ہوئے ... اس کا مطلب تھا اندر آلات نصب تھے۔ ان کے ذریعے معلوم ہو جاتا تھا کہ دروازے پر کون ہے ...

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

"انکل صدر ... السلام علیکم۔"

"بھئی میں اب صدر کہاں۔" انھوں نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہمارے لیے تو آپ اب بھی صدر ہی ہیں بلکہ ہمارے لیے کیا، ملک کے صدر تو ہیں ہی آپ ... اس وقت کا جو صدر ہے وہ تو نقلی صدر ہے ... اس نے تو ناجائز ذریعے سے ملک پر قبضہ کیا ہے اور جس نے اس کا قبضہ کروایا ہے وہ ہمارا اصل مجرم ہے، ہم ان لوگوں کو انجام تک پہنچا کر رہیں گے۔" محمود نے پر جوش انداز میں کہا۔

"آؤ بیٹھو اور یہ کہو کیسے آئے ... میرا خیال تھا کہ تم لوگ اپنی نوک جھونک میں مگن ہو گے۔"

"جی وہ آج نوک جھونک ہم سے ذرا روٹھ گئی ہے۔"

"اوہو اچھا کمال ہے حیرت ہے ... ہو گا ہو گی ۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ آپ نے کیا کہا ... ہوگا ... ہو گی ۔"

"بھئی تمھارے انداز میں جواب دیا ہے ... یعنی ہو گا کمال ... ہو گی حیرت ۔"

"اوہ ... تو آپ بھی اب ہمارے انداز میں بات کریں گے ۔"

"کیا کیا جائے ... مجبوری ہے ۔" انھوں نے یہ جملہ بھی ان کے انداز میں کہا تھا ... وہ ہنس پڑے ۔

"لیکن انکل صدر ... ہم اس وقت آپ سے کچھ باتیں کرنے کے لیے آئے ہیں ۔"

"ضرور کرو ... روکا کس نے ہے۔"

"آپ پروفیسر شنکی چانگ کے بارے میں کیا جانتے ہیں ۔"

"شائنا کے ایک سائنس دان ہیں ... ایک مدت پہلے ہمارے ملک میں آئے تھے اور انھوں نے اپنی تجربہ گاہ بنائی تھی۔ حکومت سے باقاعدہ منظوری لی تھی اور لکھ کر دیا تھا کہ ملک کے خلاف کسی قسم کی کسی سرگرمی میں شامل نہیں ہوں گے ۔"

"کیا حکومت کو ان کی تجربہ گاہ کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"حکومت کی طرف سے ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا ان کے لیے

حفاظتی عملے کی ضرورت ہے تو انھوں نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے، اس صورت میں انھیں اخراجات برداشت کرنا پڑتے۔''

''تو یہ براہِ راست شائنا سے آئے ہیں اور ان کے پاس شائنا کی شہریت کے کاغذات بھی ہوں گے۔''

''ہاں بالکل۔'' صدر صاحب نے سر ہلایا۔

''کیا اس پورے عرصے میں انھوں نے کوئی اور چیز ایجاد کی ... اپنی کسی کامیابی کے بارے میں کچھ بتایا۔

''نہیں ... مجھ سے تو خیر ان کی کبھی بھی بات نہیں ہوئی تھی ... جب وہ آئے تھے، اس وقت ان کے بارے میں اجازت لی گئی تھی ... بس اس اجازت کا مجھ سے ذکر ہوا تھا ... اس قسم کے کام تو دراصل وزارتِ خارجہ والے انجام دیتے ہیں نا۔''

''شائنا کے سفارتخانے نے ان کے بارے میں اطمینان دلایا تھا۔''

''ہاں ایسا ہوا تھا غالباً اب اچھی طرح یاد نہیں لیکن سفارت خانے میں ریکارڈ مل سکتا ہے اور وہاں پوری تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔''

''لیکن اس وقت ہم وہ تفصیل نہیں سکے افسوس۔'' محمود نے کہا۔

''اب یہ تو معلوم نہیں تھا کہ بے چارے پروفیسر شنکی کے ساتھ یہ کام ہو جائے گا۔''

''ظاہر ہے آپ کو اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہوں گی۔''

''یہی بات ہے۔''

'' ویسے کیا ہم اپنے ملک میں کسی سے موبائل پر بھی رابطہ نہیں کر سکتے کم ازکم خفیہ فورس سے تو کر ہی سکتے ہیں ... انکل اکرام سے بھی کر سکتے ہیں ... ان لوگوں سے حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں ۔''

'' حالات تو خیر ٹی وی چینلوں سے بھی معلوم ہو جائیں گے۔''

'' پہلے ہم موبائل چیک کرتے ہیں ۔''

انھوں نے سب سے پہلے خفیہ فورس کے انچارج کے نمبر ملائے، موبائل بند تھے ... اب اکرام کے نمبر ملائے ... اس کا نمبر بھی بند تھا۔

اب تو وہ اپنے تمام مہربانوں کے نمبر ملاتے چلے گئے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے تمام مہربانوں اور قریبی لوگوں کے نمبر بند کر دیے گئے ہیں اور شاید ان سب لوگوں کو نظر بند کیا ہوا ہے اسی لیے وہ فون نہیں سن سکتے۔

ان حالات نے انھیں اور پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ ادھر بڑوں نے تو گویا دروازہ نہ کھولنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وہ کئی بار ان کے کمروں سے آواز پیدا کرتے ہوئے گزرے کہ شاید کسی کو ان کی آواز سن کر ہی ان کا خیال آجائے لیکن ایسا بھی نہ ہو سکا۔

آخر فرزانہ نے کہا: ''یوں کام نہیں چلے گا۔''

'' تو تمھیں کس نے روکا ہے ... جس طرح چل سکتا ہے چلا لو۔'' فرحت مسکرائی۔

فرزانہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا، پھر اٹھ کر بڑوں کی طرف

چل دی۔

'' اکیلے ہی جانے کا ارادہ ہے یا ہمیں ساتھ لے جانا چاہتی ہو۔''
آصف ہنسا۔

'' آ جاؤ تم لوگ بھی ... کیا یاد کرو گے۔''

اور پھر فرزانہ نے بند دروازے پر دستک دے ڈالی ...

دروازہ اس کا ہاتھ لگتے ہی کھل گیا۔ اندر موجود بڑی پارٹی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا ... وہ سب شاید بری طرح مصروف تھے اور پوری طرح مگن تھے ... اس لیے انھیں چونکنا پڑ گیا تاہم ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی ناراضی کے آثار نہ آئے ...

'' خیر تو ہے، کیا باتوں کے تیر ختم ہو گئے۔'' انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

'' وہ آج چل ہی نہیں سکے ابا جان۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

'' تو محاورات کے نیزوں سے کام چلا لیتے۔''

'' وہ بھی نہیں چلے انکل۔'' آفتاب بولا۔

'' آج کیا ہو گیا ان نیزوں اور تیروں کو۔''

'' ہم اس وقت پردیس میں ہیں نا۔'' شوکی منمنایا۔

'' اوہ! ضرور یہی بات ہے ... خیر تو تم ہمارے پاس بیٹھنا چاہتے ہو اور یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔''

'' جی نہیں۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

'' کیا کہا فرزانہ ... جی نہیں۔''

'' جی ہاں۔'' وہ بولی۔

'' کبھی کہہ رہی ہو جی ہاں اور کبھی جی نہیں ... کیا ہو گیا ہے تمھیں۔''

'' ایک سوال ذہن میں گونجا ہے، اس طرف ابھی تک کسی کا دھیان نہیں گیا۔''

'' سوال کی گونج۔'' فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

'' کیوں تمھیں کیا ہوا۔'' فرحت نے اسے گھورا۔

'' میرا مطلب ہے، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔''

'' دھت تیرے کی۔'' محمود نے جھلّا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

'' ٹھیک ہے فرزانہ ... اندر آجاؤ ... ہمارے پاس اطمینان سے بیٹھ جاؤ ... پروفیسر صاحب کے تجربات میں ابھی دیر لگے گی ... وہ اپنا کام کرتے رہیں گے اور ہم تمھارے سوال کی گونج سن لیں گے۔''

'' جی اچھا۔''

اب وہ سب اندر آگئے۔ انھوں نے دیکھا گیس کے ایک میز پر کڑاہی نما ایک برتن رکھا تھا، اس میں چند سفوف تھے اور نیچے گیس کا شعلہ روشن تھا ... وہ لکڑی کی ایک سلاخ سے ان سفوفوں کو ہلا رہے تھے۔ یہ بات انھیں اس طرح معلوم ہوئی کہ اس کڑاہی میں کئی سفوف تھے ... ان کے رنگ مختلف تھے ... کوئی سیاہ تھا تو کوئی سرخ اور کوئی نیلا

تھا تو کوئی زرد ... غرض سلاخ کے چلنے کے باوجود سفوف کے رنگ الگ الگ ہی نظر آ رہے تھے۔

''ہاں فرزانہ کہو۔''

ان سب کے بیٹھ جانے کے بعد کہا

''ہم نے پروفیسر شنکی چانگ کے بارے میں شائنا سے کوئی بات نہیں کی۔''

''کیا مطلب ؟''انسپکٹر جمشید چونک گئے۔

کامران مرزا بھی حیران ہوکر فرزانہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا کہنا چاہتی ہو فرزانہ۔''انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''دیکھیے ... پروفیسر شنکی چانگ ہمارے ملک میں شائنا سے آئے تھے ... وہ ہمارے ملک میں رہ کر کچھ تجربات کرنا چاہتے تھے یا کچھ ایجاد کرنا چاہتے تھے ... کیا بات یہی نہیں۔''فرزانہ یہاں تک کہہ کر رک گئی۔

''بالکل یہی بات ہے۔''انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

''آخر کیوں وہ اپنے تجربات سے ہمارے ملک کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتے تھے یا اپنے ملک کو ... اگر ہمارے ملک کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے تو انھیں اسی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ ہر ملک کا سائنسدان جو کچھ کرتا ہے اپنے ملک اور قوم کے لیے کرتا ہے نہ کہ دوسرے کے ملک کے لیے ... پروفیسر شنکی چانگ نے اپنے ملک میں رہ کر اپنے ملک کو

فائدہ پہنچانے کیلئے یہ کام کیوں نہ کیا وہ ہمارے ملک میں کیوں آئے؟''
فرزانہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

''سوال اچھا ہے بلکہ خوب ہے۔'' انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

'' کیا ہم اس سوال کا جواب شائنا کے صدر سے نہ پوچھیں۔''

'' ضرور پوچھنا چاہیے لیکن اگر انھیں اس کا علم نہ ہو تو؟''

'' تو وہ معلومات حاصل کر کے ہمیں بتائیں گے ... دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات ہیں ... بھلا وہ کیوں نہیں بتائیں گے۔''

'' پروفیسر صاحب آپ اپنا تجربہ جاری رکھیں ... ہم ابھی آئے۔''

ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو ان سب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ... وہ اسی طرح بیٹھے لکڑی کی سلاخ کو ہلا رہے تھے۔

''آپ نے شاید ہماری بات سنی نہیں پروفیسر صاحب۔'' انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

ان کی تیز آواز سن کر پروفیسر داؤد نے سر اوپر اٹھایا، پھر ان کی طرف گھمایا اور قدرے حیران ہو کر بولے۔

'' کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا۔''

''جی ہاں ...، آپ نے میری آواز نہیں سنی۔''

'' بب ... بالکل یہی بات ہے کیونکہ میں اپنے تجربے میں اس قدر مگن تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ تم نے کب کیا کہا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ... اپنے کام میں جب کوئی صحیح معنوں میں

مگن ہوتا ہے تو اسے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں رہتا ... دراصل ہم ذرا صدر صاحب کے پاس جارہے ... آپ اپنا کام جاری رکھیں ۔''

''اچھی بات ہے ۔''انھوں نے سر ہلا دیا ۔

وہ باہر نکل آئے ... اور صدر صاحب والے کمرے تک پہنچے ... دستک کے جواب میں انھوں نے کہا ۔''آجائیں ۔''

وہ اندر داخل ہوئے تو صدر صاحب چونک اٹھے ۔

''ارے یہ کیا ... آپ تو سب کے سب آگئے ۔''

''جی نہیں... پروفیسر صاحب کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔''

''خیر تو ہے ۔''

''ایک بات فرزانہ کے ذہن میں آئی ہے ... سوچا آپ سے اس سلسلے میں بات کر لی جائے۔''

''بیٹھ جائیں سب جہاں جہاں جگہ بنتی ہے۔''

کمرہ بہت بڑا تھا اور بہت سے صوفوں سے سجا ہوا ... جب وہ سب بیٹھ گئے تو صدر صاحب پھر بولے :''ہاں اب کہیں ... کیا بات فرزانہ کے ذہن میں آئی ہے۔''

''پروفیسر شنکی چانگ ہمارے ملک میں شانا سے آئے تھے ... انھوں نے ایک سائنس دان کے طور پر دارالحکومت میں رہائش اختیار کی تھی تاکہ تجربات کر سکیں اور کوئی ایجاد وغیرہ کر سکیں ... سوال یہ ہے کیوں ... وہ ان ایجادات کے ذریعے ہمارے ملک کو فائدہ پہنچانا چاہتے

تھے ... انھوں نے ایسا اپنے ملک کے لیے کیوں نہ چاہا ۔''

صدر صاحب یہ سوال سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ شاید ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر کافی دیر کے بعد انھوں نے کہا :

'' واقعی فرزانہ نے بہت اچھا سوال اٹھایا ... لیکن شائنا چونکہ ہمارا اچھا دوست ملک ہے ، پڑوسی ملک بھی ہے ، اس لیے شاید ان سے کچھ نہیں پوچھا لیکن اب اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے ۔''

'' اسی لیے تو ہم آپ کی خدمت میں آئے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

'' کیا مطلب ؟ ''

'' دیکھیے آخر آپ ملک کے صدر ہیں ، آپ کے تعلقات دوستانہ شائنا کے صدر سے رہے ہیں ... آپ انھیں فون کریں ... ان سے اس بارے میں پوچھیں کیونکہ آج جو صورتِ حال ہے وہ پروفیسر شنکی کی وجہ سے ہے ... یہ اور بات ہے کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں اور وہ پروفیسر صباری کے جال میں آگئے ہیں لیکن آپ صدر صاحب سے پوچھ تو سکتے ہیں ...شاید اس طرح ہم کوئی کام کی بات جان سکیں ۔''

'' اچھی بات ہے ۔''

انھوں نے موبائل اٹھایا اور شائنا کے صدر کے نمبر ملائے ... گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہ اٹھایا۔

'' وہ فون نہیں سن رہے ۔''

'' ارے ہاں ... سلطان کے نمبر سے کیوں نہ فون کیا جائے۔''
انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔
'' یہ ٹھیک رہے گا۔''
سلطان برنائی کو فون کیا گیا ... انھوں نے فوراً کہا۔
'' جی، فرمایئے۔''
'' آپ ذرا دیر کے لیے ادھر آ سکتے ہیں۔''
''کیوں نہیں ... میں تو کافی دیر کے لیے آ سکتا ہوں۔'' انھوں نے خوش گوار موڈ میں کہا۔
''یہ اچھی بات ہے۔''انسپکٹر جمشید ہنسے۔
''کون سی بات ؟''
'' یہ کہ آپ زیادہ دیر کے لیے بھی آسکتے ہیں۔''
سلطان برنائی ہنس پڑے اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے موبائل بند کر دیا کہ بس ابھی آیا ... جلد ہی سلطان ان کے پاس موجود تھے ...
'' ہاں تو کیا معاملہ ہے۔''
'' ہم چاہتے ہیں آپ شانا کے صدر کو فون کریں۔''
'' اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔''انھوں نے حیران ہو کر کہا۔
انھوں نے وضاحت کر دی ... تب سلطان نے کہا:
''یعنی میں ان سے پروفیسر شنکی کے بارے میں پوچھوں۔''
''ہاں یہی بات ہے۔''

''اچھی بات ہے۔''

انھوں نے ہاٹ لائن پر شائنا کے صدر کے نمبر ملائے۔

دوسری طرف سے فوراً جواب ملا:

''یس سر۔''

''سلطان برنائی بات کر رہا ہوں ... صدر عوامی جمہوریہ شائنا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ویری ویل سر۔''

پھر جلد ہی فون میں کہا گیا: ''صدر صاحب کا کہنا ہے کہ سلطان برنائی سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔''

''اوہ !!!''

ان سب کے منہ سے نکلا۔

☆☆☆☆☆

مشکل ترین سفر

وہ خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''مطلب یہ کہ اس نے ہر طرف سے ہمارے راستے بند کر دیے ہیں ... اس کا خیال ہے کہ ہم ہر طرح سے مجبور اور بے بس ہو گئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے ... ہم لوگ اپنے راستے خود بنانے کے عادی ہیں لہٰذا ہم ایک بار پھر ذرا نقشوں کی سیر کر لیں۔'' انسپکٹر جمشید نے پرجوش انداز میں کہا۔

''جی ... کیا کہا نقشوں کی سیر۔'' فاروق بوکھلا یا۔

''کیوں اس میں کیا ہے، کیا یہ بھی کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔''

''حد ہو گئی ... بلکہ توبہ ہے تم سے۔'' فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

'' انکل کا مطلب ہے، نقشوں کے ذریعے ہم اپنا راستہ اب خود تلاش کریں گے۔'' آفتاب نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

'' مطلب سمجھانے کا شکریہ!'' فاروق نے اسے گھورا۔

'' تم لوگوں کو اگر باتیں کرنی ہیں تو کہیں اور جا بیٹھو ... کہیں ہم راستہ نہ بھول جائیں۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے جھلا کر کہا۔

'' جی کون سا راستہ۔'' آفتاب نے فوراً کہا۔

'' جو ہم نقشوں کے ذریعے تلاش کریں گے۔'' وہ چلّائے۔

'' لیکن انکل ... ابھی تو راستہ تلاش کیا ہی نہیں گیا ... وہ آپ بھول کیسے جائیں گے۔'' فاروق مسکرایا۔

'' بال کی کھال اتارنے کا ارادہ ہے کیا۔''انسپکٹر کامران مرزا نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

'' اب ہم ... میرا مطلب ہے ... چلیے خیر جانے دیں ... آپ ناراض ہو جائیں گے۔''

'' یار تم جاتے ہو یا نہیں۔''انسپکٹر جمشید چلّائے۔

'' نہیں جمشید!''پروفیسر داؤد نے انھیں فوراً روک دیا۔ پھر بولے۔

'' میرا مطلب ہے ان سے ان معصوموں سے ایسے لہجے میں بات نہ کرو۔''

'' یا اللہ رحم۔'' انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

'' ویسے تو ابا جان ... ہر حال میں رحم مانگنا چاہیے ... لیکن خاص طور پر اس وقت آپ نے رحم کیوں مانگا۔''

'' پروفیسر صاحب تم لوگوں کو معصوم کہہ رہے ہیں ... اس لیے کہا ہے یا اللہ رحم۔''

''ہائیں تو کیا ابا جان آپ کے خیال میں ہم معصوم نہیں ہیں۔''

سب نقشے پر سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

'' بس کر لیا آپ لوگوں نے اس نقشے پر کام۔'' آصف طنزیہ لہجے میں بولا۔

'' تم لوگوں سے اور امید بھی کیا ہو سکتی ہے ... کام نہ کاج کے دشمن اناج کے۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے برا سا منہ بنایا۔

'' ہائیں ہائیں انکل ... اس قدر خوفناک الزام ... اس طرح تو ہم تین میں رہیں گے نہ تیرہ میں۔'' فاروق گھبرا گیا۔

'' تو تمھیں ضرورت بھی کیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید فوراً بولے۔

'' جی کس چیز کی۔'' آفتاب نے فوراً پوچھا۔

'' تین میں اور تیرہ میں رہنے کی۔'' وہ بولے۔

'' اب آپ بھی انکل یعنی کہ۔'' آصف کہتے کہتے رک گیا۔

'' ہاں ہاں ہم بھی یعنی کہ۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

'' دیکھو ہمیں راستہ تلاش کرنے دو ... پھر راستے میں کرتے رہنا باتیں کیونکہ وہ ہوائی راستہ تو ہو گا نہیں کہ منٹوں میں ختم ہو جائے گا۔''

'' بات معقول ہے ... لہذا اب آپ کو راستہ تلاش کرنے تک ہم بالکل پریشان نہیں کریں گے۔'' آصف نے کہا۔

''جی ہاں خود ہی ایک دوسرے کو پریشان کر لیں گے۔'' شوکی نے

منہ بنایا۔

"آؤ چلیں ورنہ بڑے ہم پر گرجنے برسنے لگیں گے۔" فرزانہ نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم نے تو سنا ہے ... جو گرجتے نہیں ، وہ برستے نہیں۔" فاروق نے کہا۔

"دیکھا آپ نے ۔" فرحت نے بڑوں کی طرف منہ کیا۔

"دیکھا نہیں سنا۔" پروفیسر مسکرائے ۔

"توبہ ہے تم سے ... سرکنے کا نام نہیں لے رہے۔" فرحت نے جھلا کر کہا۔

اور پھر وہ اوپر تلے باہر نکل گئے۔ ایسے میں خان رحمان نے کہا :

"جی چاہتا تھا انکی باتیں سنتے رہیں اور نقشے لپیٹ کر رکھ دیں۔"

"آپ بھی رو میں بہہ گئے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ بنایا ۔

"رو میں بہے بغیر چارہ بھی کیا ہے ۔" پروفیسر مسکرائے ۔

"آپ لوگوں ہی نے تو انھیں سر پر چڑھایا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

"ہم سب سن رہے ہیں ... دروازے پر ہی رکے ہوئے ہیں ... ابھی گئے نہیں ۔"

"ارے تمھاری تو ایسی کی تیسی ۔" انسپکٹر جمشید نے اٹھ کر مصنوعی دوڑ لگا دی ... یعنی دروازے کی آواز پیدا کر دی۔

باہر بھی افراتفری میں دوڑنے کی آوازیں سنائی دی۔

''دیکھا ... دھوکا کھا گئے ... میں دروازے کی طرف ایک انچ نہیں گیا ... اور ان کی دوڑ لگوا دی۔''

''تمھارا جواب نہیں جمشید۔'' خان رحمان نے پرجوش ہو کر کہا۔

''دھوکا کھائیں ہمارے دشمن، ہم نے بھی مصنوعی دوڑ لگائی تھی۔''

''دھت تیرے کی ... اب ان لوگوں سے نبٹنا ہی ہو گا۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ سب وہاں سے غائب تھے۔

''دھت تیرے کی۔'' انھوں نے جھلاّ کر کہا ... پھر دروازہ اندر سے بند کر کے وہ نقشوں کے پاس آ بیٹھے اور پوری توجہ سے انھیں دیکھتے اور ان پر نشانات لگانے لگے۔

آخر کئی گھنٹے کی محنت کے بعد انھوں نے سر اوپر اٹھائے۔

''اللہ کا شکر ہے آخر ہم نے ایک راستہ تلاش کر ہی لیا ... اگرچہ وہ بہت مشکل اور دشوار گزار ہے لیکن اس راستے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ ہے بھی نہیں ... آؤ چلیں۔''

اب وہ چھوٹی پارٹی کے پاس آئے تو وہاں زور شور سے جنگ جاری تھی .. انھوں نے سنا فاروق پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا:

''تم دیکھ لینا۔''

''اچھا دیکھ لیں گے۔'' آفتاب چلاّیا۔

''کیا دیکھ لو گے۔'' محمود نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

''جو تم دکھانا چاہتے ہو۔''

''حد ہوگئی ... ہے کوئی تک۔''

''بالکل نہیں ... میں اعلان کرتا ہوں تمھاری ان باتوں میں کوئی تک نہیں ہے ... فضول باتیں ہیں وقت ضائع کر رہے ہو ... جب کہ ہم نے اپنے وقت کو بہترین طریقے سے صرف کیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید کی آواز نے ان پر سناٹا طاری کر دیا اور وہ لگے انھیں ٹکر ٹکر دیکھنے۔

''ٹھیک ہے ابا جان، انکل جان ہم معافی چاہتے ہیں ... لیکن یہ تو سنائیں نقشوں والے کام کے سلسلے میں کیا رہا۔''

''اللہ کی مہربانی سے ہم نے ایک راستہ تلاش کر لیا ہے ... راستہ طویل ضرور ہے خطرناک بھی بہت ہے اور مشکل ترین بھی لیکن ہمیں اسی راستے سے جانا ہوگا ... یہاں سے ہم ایک بڑی لانچ میں جائیں گے ... وہ لانچ آبدوز بھی ہے اور اس پر حملے کی صورت میں وہ پانی کی گہرائیوں میں جا سکتی ہے ... اس کی حفاظت کے انتظامات جدید طرز پر کیے گئے ہیں ... حملہ ہونے کی صورت میں اس لانچ سے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے گا ... سلطان کے سپاہی اس پر موجود ہوں گے ... خود ہم بھی اسلحے سے لیس ہوں گے ... امید تو نہیں کہ دوسرے ساحل تک پہنچنے تک کوئی دشمن ہمیں روکنے کی کوشش کرے گا البتہ ...''

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

''آپ کا یہ البتہ کچھ خوفناک سا ہے۔'' آفتاب نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''ہاں بے شک یہ البتہ خوفناک ہے کیونکہ اس کے بعد ہمیں ایک خوفناک جنگل میں سے گزرنا ہو گا۔ اس جنگل کے بارے میں بہت ہولناک باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک تو اس میں وحشی جانور کثرت سے رہتے ہیں۔ دوسرے سننے میں یہ آتا ہے کہ اس میں آدم خور قبائل آباد ہیں ... ان دو باتیں کے علاوہ تیسری بات بھی ہے اور وہ یہ کہ ...''

وہ ایک بار پھر کہتے کہتے رک گئے۔

''آپ جو کہتے کہتے رک جاتے ہیں نا، اس سے ہمارے دلوں کی دھڑکن بہت بڑھ جاتی ہیں۔'' شوکی نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

''اچھا میں کوشش کروں گا کہ اب نہ رکوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا اس جنگل میں ایک تیسری بات بھی سننے میں آتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں آدم خور درخت بھی موجود ہیں۔''

''جی ... کیا مطلب؟'' وہ ایک ساتھ بول اٹھے۔

''آدم خور درخت۔'' ایک دو آوازیں دوبارہ ابھریں۔

''ہاں! پاس سے گزرتی ہر جان دار چیز کو وہ اپنی شاخوں کہ لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور وہ شاخیں جاندار کو اس وقت نہیں چھوڑتیں جب تک کہ اس کے جسم کا تمام گوشت اور خون نہ ہضم کر لیں ... بس ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں اور جان دار کتنا ہی زور لگائے ... ان شاخوں سے خود

کو چھڑا نہیں سکتا۔''

'' آخر ہم اس قدر خطرناک راستے سے کیوں جائیں۔'' آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

'' اس لیے کہ اس سے کم خطرناک کوئی راستہ ہمارے پاس نہیں۔''

'' لیکن انکل ... گھنے جنگل میں ایسے درختوں کی شاخوں سے بچ کر کوئی کیسے گزر سکتا ہے۔''

'' یہ تو جنگل میں پہنچ کر ہی پتا چلے گا ... پہلا مرحلہ ان درختوں کا ہے دوسرا مرحلہ آدم خور قبائل کا، اس سے ہم بچ سکے تو تب کہیں جا کر ملک کی سرحد تک پہنچیں گے۔ ہم سرحد کیسے عبور کریں گے اور کیسے پروفیسر صباری تک پہنچیں گے، تتلیوں کا مقابلہ کیسے کریں گے، کر بھی سکیں گے یا نہیں اس بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔''

'' اور وہ جو آپ حضرات دھاتوں پر تجربہ کر رہے تھے۔'' فرزانہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

'' ہم نے چند دھاتوں پر تجربات کیے ہیں ... ان دھاتوں کو کچھ کیمیائی سفوفوں کے ذریعے پگھلایا ہے ورنہ آگ سے تو وہ دھاتیں پگھلتی نہیں۔ ان دھاتوں سے ہمیں رائفلوں کی کچھ گولیاں بنانی ہیں۔ دراصل ہم ان گولیوں سے تتلی کو نشانہ بنا کر دیکھیں گے ... ہم اپنے اس تجربے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے یا نہیں ... اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ... وہ صرف ایک تجربہ ہے جو کہ بیکار بھی ثابت ہو سکتا ہے ...

مطلب یہ کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں آگے کیا ہوتا ہے کیا حالات پیش آتے ہیں ہمیں کامیابی ملتی ہے یا ناکامی ... زندگی ملتی ہے یا موت لیکن میں ایک بات ضرور یقین سے کہہ سکتا ہوں ..."

انسپکٹر جمشید یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"اللہ کا شکر ہے ان حالات میں بھی آپ ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں، مہربانی فرما کر جلد بتائیں وہ ایک بات کیا بات ہے۔" مکھن نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ ایک بات یہ ہے کہ ہمیں جانا ہوگا ... اپنے ملک کے لیے ... اپنی قوم کے لیے یہ سفر کرنا ہو گا ... زندگی کا مشکل ترین سفر، زندگی کی خوفناک ترین مہم، زندگی کی ہولناک ترین کامیابی حاصل کرنا ہوگی ورنہ ہمارا ملک ہمیشہ کے لیے غلامی کی گود میں چلا جائے گا۔"

ان کے الفاظ ختم ہو چکے تھے لیکن وہ سب انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی کے پاس کچھ بھی کہنے کے لیے نہ ہو۔

آخر پروفیسر داؤد کی آواز گونجی: "ہم لوگوں نے اب تک جتنی زندگی گزاری جتنی مہمات سر کیں، اپنے نام کے لیے نہیں کیں، شہرت کے لیے نہیں کیں، صرف اور صرف اپنے قوم اور ملک کے لیے کیں۔ اب بھی ہم یہی مقصد لے کر روانہ ہوں گے ...ہم جو کر سکے کر گزریں گے ... نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے ہمارے نہیں۔"

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

''آپ نے ٹھیک کہا ... ہم صبح سویرے اپنی مہم پر روانہ ہوں گے اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ ہم کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں زندہ بچتے ہیں یا نہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے پر جوش لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک۔'' سب یک زبان ہو کر بولے۔

O

دوسرے دن وہ لانچ میں سوار ہو رہے تھے۔

سلطان برنائی فرداً فرداً ان سے گلے مل رہے تھے۔

ان سب کے گھر کے افراد کو سلطان کے محل ہی میں چھوڑ دیا گیا ... ظاہر ہے وہ اس مہم میں ساتھ نہیں جا سکتے تھے ... سب بھی ساحل پر کھڑے تھے ... ان سب کی آنکھوں میں اس وقت آنسو آ گئے جب لانچ نے چلنا شروع کیا اور جب سب نے ہاتھ ہلانے شروع کیے ... اور پھر لانچ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس وقت سلطان برنائی کی آواز ابھری:

''حوصلہ رکھیے اللہ ان کے اور ہمارے ساتھ ہے۔''

وہ سب تھکے تھکے قدموں سے مہمان محل کی طرف چل پڑے۔

O

لانچ کا سفر تیزی سے جاری رہا۔

یہ سمندری حدود تو تھیں ہی سلطان برنائی کی ریاست کی لہٰذا ان حدود میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا ... دس گھنٹے کے سفر کے بعد

آزاد سمندر شروع ہوتا تھا اور اس کے بعد انھیں جنگل کے ساحل پر اترنا تھا ... جنگل کے کنارے تک پہنچنے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئی ... وہ آسانی سے کنارے تک پہنچ گئے۔

اب ان کے سامنے انتہائی گھنا جنگل تھا۔ دور سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے گزرنے کا پتا سا بھی راستہ نہیں ہے۔

''اب پہلے ہمیں لانچ کا انتظام کرنا ہے کیونکہ ابھی بھی کچھ معلوم نہیں ہمیں اس طرف سے واپس آنا پڑتا ہے یا اپنے ملک میں جانا نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے لانچ کو محفوظ کر لیں پھر آگے چلیں گے۔''

انسپکٹر جمشید کے چہرے پر پریشانی نمایاں تھی۔

انھوں نے موٹے رسے کی مدد سے لانچ کو ایک بہت تن آور درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا۔ تمام ضروری چیزیں اور اسلحہ نکال لیا ... سب نے مل جل کر تمام چیزیں اٹھا لیں ...

کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں رہا تھا۔

''نقشے کے مطابق یہ جنگل بہت ہی گھنا ہے ... درندوں سے سامنا ہو سکتا ہے ... اس لیے ہاتھوں میں پستول ضرور ہونے چاہییں۔''

سب نے پستول سنبھال لیے ... سامان میں سیاہ رنگ کا ایک صندوق بھی تھا۔ اس میں پہیے لگے ہوئے تھے اور تسمہ بھی تھا۔

انسپکٹر جمشید نے اس کا تسمہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا ... اس طرح وہ بکس خود بخود ان کے پیچھے آ رہا تھا ...

"آپ نے بتایا نہیں، اس بکس میں کیا ہے۔"

"اس میں ایسا سامان ہے جو آدم خور درختوں کے علاقے سے گزرتے میں کام آئے گا۔"

"مطلب یہ کہ آدم خور درختوں کا بھی انتظام کر کے چلے ہیں۔"

"اللہ کی مہربانی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تو پھر آپ نے ہمیں اتنا کیوں ڈرایا تھا۔" آصف نے منہ بنایا۔

"ڈرانا ضرور تھا... بے خبری میں تو ہم میں سے کوئی بھی ان درختوں کی لپیٹ میں آسکتا تھا۔"

"ویسے اس موقع پر میرے ہونٹوں پر ایک لفظ آرہا ہے۔" فرحت بول اٹھی۔

"ایک لفظ... کون سا لفظ۔" اخلاق کے منہ سے نکلا۔

"بوجھو تو جانیں۔" فرحت مسکرائی۔

"اچھا میں سمجھ گیا تم کاش کہنا چاہتی ہو۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔

"حیرت ہے انکل... آپ جلد سمجھ گئے۔"

"مجبوری ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔ اور وہ لگے مسکرانے... عین اسی وقت جنگل میں ایک خوفناک آواز سنائی دی... انھیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

☆☆☆☆

کالی بلا

انھوں نے اپنی زندگی میں اتنی بھیانک آواز کبھی نہیں سنی تھی۔
وہ آواز کسی بھی درندے کی آواز سے زیادہ ہولناک تھی۔ شیروں، چیتوں، ہاتھیوں، گینڈوں اور اژدھوں کی آوازیں انھوں نے سن رکھی تھیں... لیکن یہ آواز ان سب آوازوں سے مختلف تھی۔

''شاید ہم کوئی عجوبہ دیکھنے والے ہیں۔'' کامران مرزا بڑبڑائے۔

''اور اس سے پہلے کہ وہ سامنے آئے، اپنے اپنے پستول سنبھال لیں، ان کا رخ آواز کی سمت میں کر لیں، ایسا نہ ہو کہ وہ درندہ ہمیں موقع نہ دے اور ہم پر آ پڑے۔'' خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

''آگے بڑھنے کے بجائے یہیں رکے رہیں۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''اور پوزیشن سنبھال لیں۔'' خان رحمان نے ان کی تائید کی۔

'' لیکن اس طرح تو وہ ادھر ادھر نکل جائے گا اور پھر بے خبری میں حملہ آور ہو جائے... ہمیں رکنے کی جگہ آگے بڑھتے رہنا ہو گا۔'' انسپکٹر کامران مرزا کی رائے مختلف تھی۔

''ٹھیک ہے کامران مرزا... ہم آگے بڑھیں گے۔'' انسپکٹر جمشید

نے پر جوش انداز میں کہا ۔

'' ٹھٹھ ... ٹھیک ہے ... جج ... جیسے آپ کی مم مر ...ضی۔'' مکھن نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں کہا ۔

'' آواز تو بھیک مانگتی محسوس ہو رہی ہے ۔'' آفتاب مسکرایا ۔

'' کک ... کس چیز کی بھیک ۔'' فاروق نے فوراً کہا ۔

'' پتا نہیں ...تم ٹھہرے بال کی کھال اتارنے کے ماہر ۔'' آفتاب نے جھلا کر کہا ۔

'' چلو شکر ہے تم نے مجھے کسی چیز کا ماہر تو مانا۔'' فاروق اور زیادہ خوش ہو کر بولا ۔

'' ماننے کو تو میں تمھیں اور بہت سی باتوں کا ماہر مان سکتا ہوں ۔''

'' وہ ... وہ ہماری طرف بڑھ آیا ہے ... زمین میں دھمک محسوس ہو رہی ہے ۔'' فرزانہ کی آواز ان سب کے کانوں سے ٹکرائی ۔

'' ارے باپ رے ... پھر تو اس کی طرف بڑھنے کی ضرورت نہیں رہی ، یہیں مورچے سنبھال لو ۔'' خان رحمان نے اپنے پستول پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر ان سب نے درختوں کی اوٹ لے لی ، بس صرف سر اور پستولوں والے ہاتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔ آخر انھوں نے اس بلا کو آتے دیکھ لیا ... وہ ریچھ نما جانور تھا لیکن اس کی لمبائی اور موٹائی ریچھ سے تقریباً تین گنا زیادہ تھی ... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہت بڑے سائز

کا ریچھ ہی ہو جیسا کہ انسانوں میں بھی کچھ لوگ بہت زیادہ لمبے یا بہت زیادہ موٹے ہو جاتے ہیں۔

''جو بھی ہے خطرناک ہے ، اس کے ہاتھوں کے ناخن دیکھ رہے ہیں ، کتنے لمبے اور خوفناک ہیں ... لیکن یہ ابھی بہت فاصلے پر ہے۔''

''ہاں ... ہم نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا درندہ کبھی نہیں دیکھا ہو گا ... یہ تو کسی بڑے بن مانس سے بھی دو گنا ہے ۔''

''لیکن ہم کس بات کا انتظار کر رہے ہیں ... کیا اس بات کا کہ یہ کب ہم پر آ پڑے اور تب ہم فائر کریں ۔'' پروفیسر داؤد نے جھلّاتے ہوئے انداز میں کہا۔

''واقعی ہمیں اس پر فائر کر دینا چاہیے ... چلو محمود پہلے تم اس پر فائر کرو ... لیکن صرف ایک گولی چلانا۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''ج ... جی اچھا۔'' محمود نے بوکھلا کر کہا ۔

''کیا بات ہے ، کیا تم اس پر گولی چلانے سے گھبرا رہے ہو ... رہنے دو میں فائر کرتا ہوں ۔'' آصف نے اسے گھورا ۔

''نہیں میں گھبرا نہیں رہا ... ابھی تم دیکھو گے میں کتنی بہادری سے فائر کرتا ہوں ۔''

''ظاہر ہے ہم ضرور دیکھیں گے آنکھیں تو بند کرنے سے رہے۔''

اور پھر محمود نے اس پر فائر کیا ... انھوں نے بالکل صاف محسوس کیا کہ محمود کا نشانہ بالکل ٹھیک تھا اور گولی اس کی سیدھ میں گئی تھی۔

لیکن اس درندے کو نہ لگ سکی کیونکہ وہ بہت اونچا اچھلا تھا اور شاید گولی اس کے نیچے سے نکل گئی تھی۔ پھر جونہی اس کے پیر نیچے لگے ، وہ اس طرف تیر کی طرح آیا جہاں سب چھپے ہوئے تھے۔

"ایک ساتھ فائر کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔

ان سب نے اس پر فائر کیے ... وہ کسی گیند کی طرح اوپر اچھلا اور انھوں نے صاف محسوس کر لیا کہ اسے ایک گولی بھی نہیں لگی تھی۔

اب تو ان سب کی سٹی گم ہوگئی۔

"ارے باپ رے ... یہ تو گولی سے بچنے میں شاید ہم سے بھی زیادہ ماہر ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

ادھر وہ برابر ان کی طرف بڑھ رہا تھا ... اس کی رفتار بہت تیز تھی ... پہلے تو وہ بہت فاصلے پر تھا لیکن اب تو درمیانی فاصلہ کم رہ گیا تھا۔

"پھر فائر کرو اور اس مرتبہ اس حساب سے فائر کرو کہ یہ کتنا اوپر اچھلتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔

ایک بار پھر انھوں نے فائر کیے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اونچا اچھلا اور پھر اس کے منہ سے بھیانک چیخیں نکلیں۔

اس کا مطلب تھا گولیاں اسے لگ گئی ہیں۔

"وہ مارا۔" ان میں سے کئی کے منہ سے نکلا۔

گولیاں کھا کر وہ دھب سے گرا تھا لیکن اس کا جسم ایک بار پھر اونچا اچھلا تھا اور ایسا شاید گولیوں کی تکلیف کی وجہ سے تھا۔

اس بار جو وہ زمین پر آیا تھا گرنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا۔
انھوں اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہتے دیکھا۔
دوسرے لمحے مارے خوف کے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
وہ اب پھر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وہ اسے بالکل صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔
وہ بن مانس کی قسم کا درندہ تھا لیکن جسامت میں تھا دوگنا۔
''فائر۔'' انسپکٹر جمشید چلاّئے۔
ان سب نے پھر فائر کیے ... اس بار اس کے منہ سے اور زیادہ ہولناک چیخیں بلند ہوئی اور پھر وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے چیخوں کی بجائے سیٹیاں نکل رہی تھیں جیسے کسی بھاپ کے انجن سے نکل رہی ہوں۔ وہ حیرت سے پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔
دس منٹ تک یہ عالم جاری رہا، تب کہیں جا کر وہ ساکت ہوا۔
انھوں نے دیکھا جس جگہ وہ گرا تھا اس جگہ کے چاروں طرف خون ہی خون تھا ... جھاگ دار خون۔
''چاروں طرف پھیلے خون کی وجہ سے ہم اس کے زیادہ قریب نہیں جاسکتے۔ اب آؤ راستہ کاٹ کر آگے بڑھتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔
ابھی وہ آگے بڑھنے ہی لگے تھے کہ وہ دھک سے رہ گئے۔
بالکل ایسے ہی تین درندے اور چلے آرہے تھے...
'' ارے ہم نے تو اس ایک کو ہی بہت مشکل سے مارا ہے، یہ تو

تین اور آ گئے ... اب ... اب کیا ہو گا۔"

"یہاں سے واپس بھاگ چلتے ہیں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"ہماری کمر پر سمندر ہے اور آگے یہ جنگل ... بھاگ کر جائیں گے کہاں ... اور کیا ان بن مانسوں جیسے درندوں سے شکست کھا کر ہم اپنا مشن نامکمل چھوڑ دیں گے، نہیں ہر گز نہیں۔" خان رحمان نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن اگر یہ اور بھی زیادہ تعداد میں نکل آئے تو ہم کب تک اور کیسے ان کا مقابلہ کریں گے۔"

"اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو گا۔"

"کیا ہم لانچ میں سوار ہو کر بہتر طور پر مقابلہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ یہ ساحل سے آگے تو نہیں بڑھ پائیں گے۔" آصف نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے ... یہ پانی میں نہیں اتریں گے ... چلو مان لیا لیکن ہم کب تک لانچ پر بیٹھیں رہیں گے ... یہ تو اب ٹلیں گے نہیں ... اپنے ساتھی کی لاش کو دیکھنے کے بعد یہ کسی صورت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے ... مطلب یہ کہ ہمارے پاس اب ایک ہی راستہ ہے ... اور وہ ہے ان سے باقاعدہ جنگ ... لہٰذا ان تینوں پر تین حصّوں میں تقسیم ہو کر فائر کرو ... ایک حصّے کی کمان خان رحمان کریں گے، ایک کی انسپکٹر کامران مرزا اور تیسرے کی میں ... خان رحمان کی طرف شوکی برادرز چلے جائیں ... محمود، فاروق اور فرزانہ میرے پیچھے آجائیں اور

انسپکٹر کامران مرزا کے پیچھے آصف، آفتاب اور فرحت۔ پروفیسر صاحب ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

"کیوں نہ میں اپنا حربہ ان پر استعمال کروں۔"

"اوہ ہاں... بلکہ پہلے آپ ہی تجربہ کر لیں۔"

"بس تو پھر پارٹیوں کے اعتبار سے سب الگ الگ ہو جاؤ... درختوں کی اوٹ لے لو... میں ان تینوں پر وار کروں گا۔"

دوسری طرف تینوں درندے اب اپنے ساتھی کی لاش تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اس کے گرد کھڑے تھے۔ اس کے جسم سے بہنے والے خون کو اپنے ہاتھوں پر لگا لگا کر سونگھ رہے تھے جیسے جاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ان کے ساتھی کا خون کس نے بہایا ہے۔

پھر وہ سیدھے ہوئے اور ان کی طرف بڑھنے لگے...

عین اس وقت پروفیسر داؤد نے شیشے کی ایک گیند ان پر دے ماری... گیند ان کے پیروں پھٹی... ایک خوف ناک دھماکا ہوا... وہ تینوں فٹ بال کی طرح اچھلے اور نیچے گر گئے... گیند سے سفید دھواں نکلا تھا... تینوں آن کی آن میں اس دھوئیں کی لپیٹ میں آگئے اور اس میں لوٹ پھوٹ ہونے لگے۔

"یہ بہت زہریلا دھواں ہے... ہوا کا رخ آگے کی طرف ہے اس لیے ہماری طرف تو فی الحال آئے گا نہیں... ان تینوں کا کام ضرور تمام کر دے گا۔"

'' بہت خوب پروفیسر صاحب آپ کی یہ گیند بہت خوب رہی۔''
'' لیکن پہلے ہمیں یہ یقین کرنا ہوگا کہ یہ مر چکے ہیں۔''
'' اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس جیسے کچھ اور بن مانس اس جنگل میں ہو سکتے ہیں۔''
'' لل ... لیکن۔'' پروفیسر صاحب گھبرا گئے۔
'' آپ کی آواز میں شدید گھبراہٹ ...'' انسپکٹر جمشید چونکے۔
'' مم ... میرے پاس تو بس یہی ایک گیند تھی۔''
'' کیا !!!'' وہ چلّا اٹھے۔
'' ہاں یہی گیند تھی بس۔''
'' لیکن پروفیسر انکل آپ کے پاس اور حربے بھی تو ہوتے ہیں۔''
'' ہوتے ہیں لیکن وہ وقتی طور پر کام نکالنے کے لیے ہوتے ہیں... اتنے مہلک نہیں ہوتے ...یہ تو میں نے ان کے خطرے کے پیش نظر مہلک گیند پھینک ماری تھی۔''
'' اگر یہ ادھر ادھر سے کچھ اور نکل آئے تو کیا بنے گا۔'' آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔
'' وہی بنے گا جو اللہ بنائیں گے ، ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' فاروق نے کندھے اچکائے۔
'' میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے ، اب اگر کچھ اور ہوں گے بھی تو وہ پہلے ادھر آئیں گے پھر ہماری تلاش میں نکلیں گے ...

اتنی دیر میں ہم دور جا چکے ہوں گے ، اس طرح امکان ہے کہ ہمارا اور ان کا سامنا نہ ہو۔''

''یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔''انسپکٹر کامران مرزا نے تائید کی ۔

پھر وہ وہاں سے راستہ قدرے کاٹ کر بہت تیزی سے روانہ ہوئے ... بس آگے بڑھتے چلے گئے لیکن پھر ایک جگہ انھیں رک جانا پڑا۔

انہوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔

انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ ان کے سامنے دس بارہ اسی جتنے بن مانس کھڑے تھے۔ انھوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو ، پیچھے بھی دس بارہ کھڑے نظر آئے۔

گویا وہ ان کے گھیرے میں تھے ... دائیں بائیں نکلنے کی کوشش کرتے تب بھی وہ ان تک پہنچ جاتے کیونکہ وہ ان کی رفتار دیکھ چکے تھے ... وہ بہت لمبی چھلانگیں لگا کر آگے بڑھتے تھے ، اتنی لمبی کہ انسان کے لیے اس قدر چھلانگ لگانا ممکن ہی نہیں تھا۔

''درختوں پر چڑھ جاؤ۔'' انسپکٹر جمشید چلاّ اٹھے ۔

☆☆☆☆☆

گھیرے میں

انہوں نے درختوں پر چڑھتے میں دیر نہ لگائی۔
درخت اس قسم کے تھے جیسے بڑ کے ہوتے ہیں۔ ان پر چڑھنا کچھ مشکل ثابت نہ ہوا۔ ایسے میں آفتاب کی آواز ابھری:
''لیکن انکل یہ بن مانس بھی درختوں پر چڑھنے والے ہو سکتے ہیں ... یہ شیر تو ہیں نہیں جن کی خالہ نے درختوں پر چڑھنا نہیں سکھایا تھا۔'' آصف ہنسا۔
''ہو سکتا ہے ان بن مانسوں کی بھی کوئی خالہ ہو۔'' آفتاب مسکرایا۔
''اگر ان بن مانسوں کو درختوں پر چڑھنا آتا ہے تب ہم خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہونے والے ہیں۔''
''اللہ کا شکر ہے۔'' فاروق خوش ہو گیا۔
''لو اور سنو، کہہ رہے ہیں اللہ کا شکر ہے ... ارے میاں انکل نے کہا ہے ہم خطرناک صورتِ حال سے دو چار ہونے والے ہیں۔''
''میں نے یہ اس لیے کہا ہے کہ ابا جان نے یہ نہیں کہا ... ہم چار آٹھ ہونے والے ہیں۔''

''ہے کوئی تک۔'' آصف چلا اٹھا۔

''بالکل نہیں ...میں تائید کرتا ہوں۔''محمود نے فوراً کہا۔

بن مانس برابر ان درختوں کی طرف آرہے تھے جن پر انھوں نے پناہ لی تھی۔

''نہیں ہوگی کوئی تک، لیکن میں پھر کہتا ہوں، اللہ کا شکر ہے۔''

''فاروق ٹھیک کہتا ہے، اللہ کا شکر ہر حال میں ادا کرنا چاہیے۔'' پروفیسر داؤد نے منہ بنایا۔

''اگر اتنے ہی اور آگئے اور سب مل کر درختوں پر چڑھنے لگے تو کیا پھر بھی فاروق یہی کہے گا ... کہ اللہ کا شکر ہے۔''فرحت جھلا اٹھی۔

''ہاں بالکل۔''فاروق نے فوراً کہا۔

''میں بھی یہی کہتا ہوں ہاں بالکل۔''پروفیسر بولے۔

''میں بھی۔''خان رحمان نے کہا۔

''ہیں بھی۔'' انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے ایک ساتھ کہا۔

''بس بس ... اب ہم بھی کہتے ہیں۔''آصف وغیرہ نے گھبرا کر کہا اور وہ سب ان حالات میں بھی مسکرانے لگے۔

''ارے یہ دیکھو ... مجھے ایسا لگا کہ بن مانس بھی مسکرا رہے ہیں۔'' شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ اس لیے نہیں مسکرا رہے کہ انھیں اپنے دوست نظر آگئے ہیں بلکہ اس لیے مسکرا رہے ہیں کہ انھیں اپنے شکار نظر آگئے ہیں۔ بن مانس

تو انھیں ہم کہہ رہے ہیں لیکن یہ بن مانس نہیں ہیں ... ہمیں چیر پھاڑ کر کھانے کے لیے مسکرا رہے ہیں۔''

'' انکل آپ تو ہمارا خون خشک کیے دے رہے ہیں۔'' مکھن نے کانپتی آواز میں کہا۔

'' اوہ معاف کرنا بھئی۔'' انھوں نے فوراً کہا۔

پھر ان کے رنگ اڑ گئے ، کیونکہ بن مانس واقعی اوپر آ رہے تھے۔

''م م... مارے گئے۔''

'' تو ہم ان پر فائر کیوں نہیں کرتے۔''

''اس طرح ہمارا سارا اسلحہ انہی پر ختم ہو جائے گا جب کہ ابھی ہمیں آدم خور جنگل سے بھی گزرنا ہے۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

'' لیکن انکل اگر ہم ان کا لقمہ بن گئے تو آدم خور بے چارے ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔''

'' ان بیچاروں کے پاس بگاڑنے کے لیے رہ ہی کیا جائے گا۔''

''یار چپ رہو بن مانس اوپر آ رہے ہیں اور ہم باتیں بنا رہے ہیں ... ارے یار ان کا کچھ کرو ، ہم نے ان کے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا ہے یہ ہم سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔'' پروفیسر چلّائے۔

'' ایک ایک گولی ان کے سروں میں کیوں نہ اتار دیں ... اس طرح ہماری زیادہ گولیاں ضائع نہیں ہوں گی۔''

''یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں ... دراصل آگے ہمیں ایک ایک

گولی کی ضرورت پیش آ سکتی ہے لیکن اب کیا کیا جائے فی الحال تو ان سے نبٹنا ہے ... چلو بھئی اتار دو ان کے سروں میں ایک ایک گولی ... اب یہ درختوں پر چڑھ رہے ہیں گولیوں کے وار نہیں بچا سکیں گے۔"

اور پھر فائروں کی آوازیں گونج اٹھیں۔

گولیاں ان کے سروں میں لگیں۔ وہ الٹ الٹ کر گرے۔

ان کے چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں لیکن فوراً ہی یہ مسکراہٹیں بجھ گئیں کیونکہ انھوں نے جنگل کے چاروں طرف سے ایسے ہی بہت سے بن مانسوں کو آتے دیکھا تھا۔

"ارے یہ ختم ہونے ہی میں نہیں آرہے ... لگتا ہے ہمارے پاس گولیاں ختم ہو جائیں گی لیکن یہ تمام ختم نہیں ہوں گے۔"

"اُف اب کیا کریں۔"

"اللہ کو یاد کرنا چاہیے۔"

"واقعی۔"

اور وہ لگے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنے۔

ادھر بن مانس چلے آرہے تھے ... پھر وہ درختوں پر چڑھ گئے۔

"اب اس کے سوا چارہ نہیں کی بچی کھچی گولیاں بھی ان کے سروں میں اتار دیں۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوگا ... لیکن ہم آخر دم تک لڑتے ہوئے تو مارے جائیں گے نا۔"

ایسے میں شوکی نے اپنی قمیص اتار لی ...

''کیا ہوا بھائی ، گرمی لگ رہی ہے لیکن ہوا تو ٹھنڈی ہے۔'' آفتاب نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ...

دونوں ایک ہی درخت پر تھے ...

شوکی نے کوئی جواب نہ دیا ... پھر اس کے ہاتھ میں لائٹر نظر آیا۔

اور اس نے لائٹر کا شعلہ قمیص کے نیچے کر دیا ...

'' ارے یہ کیا ... ننگے مرنا چاہتے ہو ... لوگ کیا کہیں گے۔'' فاروق چلّا اٹھا۔

''کون سے لوگ ... ان بن مانسوں کو لوگ کہہ رہے ہو۔'' محمود نے ہانک لگائی۔

ادھر شوکی کی قمیص آگ پکڑ چکی تھی۔ اس نے قمیص کا اوپر والا سرا پکڑ کر جلتا سرا نیچے لٹکا دیا۔ بن مانس نے جو آگ کا شعلہ اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے فوراً نیچے چھلانگ لگا دی۔

اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا ...

'' ارے ! '' ان سب کے منہ سے نکلا۔

'' وہ مارا ... اب سمجھ میں آیا یہ آگ سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ جسم پر بے تحاشہ بال ہیں نا ... ان کے بال اگر آگ پکڑ لیں تو یہ جل کر بھسم ہو جائیں۔ شوکی زندہ باد ، نیچے اتر جاؤ شوکی اور جلتی قمیص ان میں سے ایک ایک کے پاس لے جاؤ ... یہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔''

انسپکٹر جمشید پر جوش انداز میں چلائے۔

''جی اچھا۔'' شوکی نے کہا اور اوپر سے ہی چھلانگ لگا دی۔

اب جو جلتی قمیص ہاتھ میں لیے ساتھ والے درخت کی طرف بڑھا تو اس درخت والا بن مانس بھی بدحواس ہو کر بھاگا اور پھر تو ان میں ایسی بھگدڑ مچی کہ جیسے موت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔

''شوکی نے میدان مار لیا۔'' خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

''وہ بھی صرف قمیص کی قربانی دے کر۔'' آصف نے جل کر کہا۔

''بھئی تم دے دیتے قربانی اپنی قمیص کی، تمہیں کس نے روکا تھا۔'' مکھن نے منہ بنایا۔

اب وہ سب نیچے اتر آئے۔

انہوں نے بہت سی شاخیں جمع کیں اور انھیں آگ لگا دی۔

محمود کے چاقو سے ایک موٹی شاخ کاٹی گئی، اس کے سرے کو ان باریک جلتی شاخوں کی مدد سے آگ دکھائی گئی، ایسی کچھ اور شاخیں کاٹی گئیں۔ ان کے سروں کو بھی آگ لگائی گئی اس طرح ان جلتی شاخوں کا ہاتھوں میں لیے وہ آگے بڑھے۔ ان کا سفر جاری رہا...

بن مانس اس طرح غائب تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ...

''اور میرا خیال ہے انکل۔'' شوکی کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''جلتی ہوئی ان شاخوں کی مدد سے تو ہم آدم خور درختوں سے بھی

بچ کر گزر سکتے ہیں ... آگ سے تو ان درختوں کی شاخوں کو بھی جھلسا جا سکتا ہے۔"

"نہیں ... ان کے لیے ہمارے پاس یہ سیاہ رنگ کا بکس ہے ... درختوں کی آگ دکھانے کی صورت میں خطرہ یہ ہے کہ اس طرح پورا جنگل آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا اور جنگلی جانور جھلس جائیں گے ... اور یہ اچھا نہیں بلکہ نا پسندیدہ ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"بالکل ٹھیک کامران مرزا۔" پروفیسر داؤد نے فوراً کہا۔

اور پھر وہ ایک اور جنگل کے کنارے پہنچے ... ساتھ میں وہ نقشوں سے بھی مدد لے رہے تھے اور ان نقشوں کی معلومات کی روشنی میں یہی وہ جنگل تھا جس کے درخت آدم خور تھے بلکہ صرف آدم خور نہیں وہ تو جانوروں کو بھی ہضم کر جاتے تھے ... ان کی زد میں جو جاندار آ جاتا بس اسے لپیٹ میں لے لیتے تھے ...نقشوں میں ان درختوں کی جو نشانیاں تھیں وہ ان پر پوری اترتی تھیں اس لیے انھوں نے جان لیا کہ وہ خطرناک جنگل میں آ گئے ہیں چنانچہ انسپکٹر جمشید نے اس میں داخل ہونے سے پہلے وہ سیاہ رنگ کا بکس کھولا جو اپنے پہیوں پر چلتا رہا تھا۔

انہوں نے دیکھا، اس بکس میں چمکتی دمکتی لمبی لمبی تلواریں موجود تھیں ...ان سب کے منہ سے نکلا ... "اوہ۔"

"ہر آدمی ایک تلوار ہاتھ میں لے لے ... ان درختوں کی شاخیں جہاں راستہ روکے ہوئے نظر آئیں گی وہاں ہم ان تلواروں سے کام

لیں گے یعنی تلواروں کی مدد سے شاخوں کو کاٹ ڈالیں گے ... اس طرح اپنا راستہ بناتے چلے جائیں گے ، ویسے یہ جنگل زیادہ طویل بھی نہیں ہے ، امید ہے اس ترکیب کے بعد ہم میں سے کوئی بھی کسی درخت میں نہیں پھنسے گا۔"

"انشاء اللہ۔" سب نے ایک ساتھ کہا۔

اور پھر واقعی ان تلواروں کی مدد سے ان کا سفر اس خطرناک ترین جنگل میں بہت آسانی سے طے ہو گیا ... سچ ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل عطا فرمائی ہے ، اس سے وہ بڑے کام لے سکتا ہے۔

اب ان کا سفر ایک بہت آسان جنگل سے شروع ہوا۔

وہ منزلیں پر منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ ان کا یہ سفر تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ کھانے پینے کا کافی سامان وہ لے کر چلے تھے۔ کچھ وہ درختوں سے اور چشموں سے بھی کام چلا رہے تھے۔

ان حالات میں ایک روز فرزانہ بری طرح چونکی۔

اس کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔

"لگتا ہے تمھیں کوئی جن بھوت نظر آ گیا ہے ..." آفتاب نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نن ... بلکہ میں زمین کی دھمک سن رہی ہوں ... لگتا ہے کوئی فوج ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔"

"فوج ... کیا کہہ رہی ہو فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

''میرا خیال تو یہی ہے کہ پوری ایک فوج کی دھمک سنائی دے رہی ہے اور ...'' فرزانہ نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

''اور کیا ؟''

''اور وہ ایک سمت سے ہماری طرف نہیں بڑھ رہے بلکہ تین سمت سے بڑھ رہے ہیں اور اب تو میں ایک بات اور بھی کہہ سکتی ہوں۔''

''بار بار خون خشک نہ کرو، جتنا کرنا ہے ایک ہی بار کر لو۔'' شوکی نے براسا منہ بنایا

''اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری کمر کی طرف سے بھی آ جائیں تاکہ گھیراؤ مکمل ہو جائے ... اس وقت اگر ہم ان کے گھیرے سے نکل سکتے ہیں تو جس راستے سے آئے ہیں اسی راستے کی طرف دوڑ لگا کر نکل سکتے ہیں لیکن پھر اس کے بعد یہ ہوگا کہ وہ فوج ہمارا تعاقب کرے گی اور میرا خیال ہے وہ ہم سے زیادہ تیز طرار لوگ ہیں۔''

''تم نے خون خشک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' شوکی نے کانپ کر کہا۔

''پھر ہم بھلا پورے ایک لشکر کے مقابلے میں کیا کریں گے۔'' آصف نے کہا۔

''مجھے پتا نہیں ہم کیا کریں گے یا کیا نہیں ... ہمارے پاس سوچنے کا وقت بہت کم ہے ... خان رحمان کیا ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ پورے ایک لشکر کو روک سکیں جو تین طرف سے بڑھ رہا ہے اور ہو سکتا

ہے جب تک وہ نزدیک پہنچے ہم چاروں طرف سے گھیرے میں ہوں۔''

''ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہو سکتا ... ویسے ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے۔''

''کم ازکم تین ہزار۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

''لیکن فرزانہ بھلا تم تعداد کے بارے میں اس قدر یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔'' فرحت نے اعتراض کیا۔

''میں یہ بات یقین سے نہیں اندازے سے کہی ہے اور اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن بہرحال دو ہزار سے تو کسی طرح کم نہیں ہو سکتا کیونکہ میرے کان آوازیں سن رہے ہیں۔''

''اور فرزانہ کے کان کوئی عام کان نہیں ہیں۔'' فاروق مسکرایا۔

''ہم درختوں پر چڑھ کر بھی خود کو نہیں بچا سکتے۔'' خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

''نہیں جنگلی ہم سے زیادہ تیز ہوتے ہیں درختوں پر چڑھنے میں۔''

''بس پھر ہمارے سامنے فی الحال ایک ہی راستہ ہے ... اور وہ یہ جس راستے سے آئے ہیں اسی طرف دوڑ لگا دیں اور کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر ان سے مقابلہ کرنے کی تیاری کر لیں۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے بلند آواز میں کہا۔

''یہی کرنا ہو گا ... وہ بھی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر۔''

اور پھر انھوں نے دوڑ لگا دی ... جلد ہی حسب معمول پروفیسر داؤد

سب سے پیچھے رہ گئے ... یہ بات محسوس کرتے ہی انسپکٹر جمشید حسب معمول رک گئے اور جب پروفیسر داؤد ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے یک دم جھک کر انھیں کندھے پر ڈال لیا اور دوڑ لگا دی۔

ان کے ساتھ وہ اپنے بکس کو بھی گھسیٹ رہے تھے۔

یہ دیکھ کر بکس کا انسپکٹر کامران مرزا نے پکڑ لیا...

اب دونوں بلا کی رفتار سے دوڑ پڑے اور جلد ہی کئی ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ان حالات میں پروفیسر داؤد کی آواز ابھری۔

"مجھے افسوس ہے جمشید ایسے اوقات میں میں ہمیشہ تمھارے لیے مصیبت بنتا ہوں۔" ان کی آواز سے دکھ جھانک رہا تھا۔

"ایسا نہ کہیں پروفیسر صاحب، آپ یہ بھی تو دیکھیں آپ ہمارے ملک کے اتنے بڑے سائنس دان ہیں اور ہمارے ساتھ دھکّے کھاتے پھرتے ہیں ... کیا یہ کام آپ کے کرنے کے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے آنسو آ گئے ...

لیکن ان آنسوؤں کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا کیونکہ وہ تو اس وقت دوڑ رہے تھے اور باقی لوگ بھی دوڑ رہے تھے اور دوڑتے ہوئے بھلا وہ کس طرح کسی کی آنکھوں میں دیکھ سکتے تھے تاہم ان کی آواز سے پروفیسر داؤد نے اندازہ لگا لیا... وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

"رو رہے ہو جمشید۔"

"جج ... جی نہیں ... بس ذرا آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔"

'' بری بات جمشید ... تم جیسے شخص کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے ... تم تو ایک پہاڑ ہو پہاڑ اور اس وقت تو میرے ساتھ دوسرا پہاڑ بھی ہے ... انسپکٹر کامران مرزا ... ''

'' میرا خیال ہے ہمیں فرزانہ سے رپورٹ لے لینی چاہیے۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

یہ کہہ کر انھوں نے دائیں بائیں دیکھا ... فرزانہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر دوڑی جا رہی تھی ... انھوں نے فوراً منہ سے آواز نکالی :

'' زمین سے کان لگا کر اندازہ لے لو ... آوازیں پہلے کی نسبت نزدیک ہیں یا دور۔''

'' اچھی بات ہے انکل۔''

یہ کہتے ہی وہ رک گئی اور زمین پر لیٹ گئی۔

اس نے اپنا کان زمین پر لگا دیا لیکن ابھی اس کے ساتھی وہاں سے گزر رہے تھے اور ان کی دھمک بھی زمین میں شامل تھی ، اس لیے اسے انتظار کرنا پڑ گیا ... جب سب اس جگہ سے آگے نکل گئے تب اس نے غور کیا اور آخر اٹھتے ہوئے بولی۔

'' آوازیں پہلے کی نسبت دور ہو گئی ہیں ... اس کا مطلب ہے ہم کافی آگے آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ، درمیانی فاصلہ بڑھ گیا ہے۔''

'' بس تو پھر تھوڑا زور اور لگا لیتے ہیں ... اس طرح ہم اور زیادہ فاصلے پر ہو جائیں گے اور بہتر طور پر جنگ کی تیاری کر سکیں گے۔''

انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

''وہ تین ہزار ہیں اور ہم چودہ، بھلا ہم کیا کر لیں گے۔''

''یہ بتانا خان رحمان کا کام ہے۔''

''ہاں ضرور لیکن ہم کسی محفوظ جگہ پر تو پہنچ لیں ... جگہ کا انتخاب میں خود کروں گا ... جونہی مجھے جنگ کے قابل کوئی میدان نظر آئے گا میں سب کو رک جانے کے لیے کہوں گا۔''

''جی اچھا۔'' کئی آوازیں ابھریں۔

وہ دوڑتے رہے ... اور آخر ایک جگہ خان رحمان پکار اٹھے۔

''بس ٹھیک ہے ... یہ مناسب ترین جگہ ہے۔''

وہ سب رک گئے ... انھوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

یہاں درخت بہت گھنے تھے اور اس جگہ سے پہلے ایک کافی کھلا میدان تھا یعنی وہاں درخت نہیں تھے یا اکا دکا تھے ...

''یہ اللہ کی عین مہربانی ہے ورنہ گھنے جنگل میں میدان کہاں۔''

''لیکن انکل ... یہ میدان ہمارے کس کام آئے گا۔''

''جلد معلوم ہو جائے گا جمشید ... تم سب میں اسلحہ تقسیم کر دو۔''

''اچھی بات ہے۔''

جلد ہی اُن میں اسلحہ تقسیم کر ہو رہا تھا اور وہ یہ محسوس کر رہے تھے جیسے وہ کوئی باقاعدہ فوج ہوں۔ اسلحے کی تقسیم کے بعد خان رحمان نے انھیں درختوں کے پیچھے ایک ایک کر کے کھڑا کر دیا، ہدایات بھی دیں

... ان میں سے صرف پروفیسر صاحب کو پچھلی طرف منہ کر کے پوزیشن لینے کی ہدایات دی تا کہ اس طرف سے حملہ آور آتے نظر آئیں تو وہ اپنے ساتھیوں کو خبردار کر سکیں ... ویسے اس طرف جنگلیوں کے آنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ جب تمام ساتھیوں نے ان کی ہدایت کے مطابق خوب اچھی طرح مورچے سنبھال لیے، تب خان رحمان نے کہا:

''جب تک میں نہ کہوں فائرنگ نہ شروع کریں، جب میں کہوں تب کریں لیکن لگا تار نہ کریں بلکہ نشانہ لے لے کر کریں تا کہ ہماری گولیاں ضائع نہ ہوں ...ہمیں معلوم نہیں کہ دشمن کے پاس آتشیں اسلحہ ہے یا نہیں ... اگر ان کے پاس صرف نیزے، بھالے اور تیر ہوئے تو ہمارے لیے مقابلہ زیادہ مشکل نہیں ہو گا لیکن اگر ان کے پاس گولیاں ہوئیں تو مقابلہ نا آسان نہیں ہو گا کیونکہ ان کی تعداد کئی ہزار ہے۔''

''تو کیاان حالات میں یہ بہتر نہیں رہے گا کہ ہم یہاں سے بھاگ نکلیں اور اتنی دور چلے جائیں جہاں ان کے آنے کو کوئی امکان نہ رہ جائے ...کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔'' اخلاق نے تجویز پیش کی۔

''لیکن آنا تو ہمیں پھر بھی ادھر ہی ہوگا ... راستہ جو یہی ہے۔'' خان رحمان نے کہا۔

''ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' ان حالات میں شوکی کی آواز ابھری۔

''چلو بتا دو وہ کون سی بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''جنگلیوں کو کیسے پتا چل گیا کہ ہم جنگل میں داخل ہو چکے ہیں۔''

''شاید ان میں سے چند ان اطراف میں موجود تھے ... انھوں نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا ... ہم نے انھیں نہیں دیکھا تھا ... بس وہ درختوں کی اوٹ لیتے اپنے ساتھیوں کی طرف چلے گئے اور انھیں ہم لوگوں کے بارے میں بتا دیا۔''

''فرزانہ ... ایک بار پھر چیک کرو۔'' خان رحمان نے کہا۔

''جی اچھا۔''

فرزانہ نے کان ایک بار پھر زمین پر لگا دیے۔

پھر فوراً ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی ... اس کے منہ سے نکلا:

''وہ ابھی فاصلے پر ہیں ... شاید ہم بہت تیز دوڑے ہیں جب کہ انھیں کوئی جلدی نہیں ہے ... شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔''

''لیکن!'' فرحت نے اچانک کہا اور اس کا یہ لیکن بہت زور دار اور عجیب سا تھا ... سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

☆☆☆☆☆

جنگ کا آغاز

''تم یہ لیکن کہاں سے لے آئیں۔''فرزانہ نے اسے گھورا۔

''ایسے بہت سے لیکن ہر وقت میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔'' فرحت مسکرائی۔

''معلوم ہو گیا کہ تم لیکن جمع کرنے کی شوقین ہو۔'' محمود نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''اصل بات تو پوچھی نہیں اور لیکن کے پیچھے پڑ گئے... سوال یہ ہے کہ اس وقت فرحت نے لیکن کیوں کہا۔''فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

''بالکل ٹھیک ، چلو فرحت جلدی بتاؤ۔''انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

''سوال یہ ہے کہ ہم ان لوگوں سے جنگ کیوں کریں۔''

''تو پھر کیا کریں... خود کو ان کے حوالے کر دیں۔''محمود نے آنکھیں نکالیں۔

''آنکھیں نکالنے سے بہتر ہے... اس کی بات سن لی جائے۔'' آصف نے مشورہ دیا۔

''اچھی بات ہے... چلو فرحت بات بتاؤ۔'' فرزانہ نے فوراً کہا۔

''ہم لوگ ان سے جنگ کیے بغیر بھی اپنا راستہ لے سکتے ہیں۔''

''ہائیں وہ کیسے۔''

''ہم نے ان درختوں کی اوٹ لے رکھی ہے، درخت بہت لمبے چوڑے تنوں والے ہیں، ان کے پیچھے بہت آسانی سے چھپا جا سکتا ہے۔ جونہی لشکر یہاں سے گزرنے لگے گا ہم درختوں کے دوسری طرف سرک جائیں گے ... اس طرح وہ ہمیں دیکھ نہیں سکیں گے، اس طرح جب وہ آگے نکل جائیں گے تو ہم اس طرف دوڑ لگا دیں گے جس طرف سے وہ آئے ہیں ... ہمارا راستہ بھی اسی طرف ہے۔''

فرحت کی ترکیب سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

پھر انسپکٹر کامران مرزا نے کہا:

''ایسا اس وقت ممکن تھا جب ان کی تعداد سو دو سو ہوتی ... لیکن فرزانہ کے اندازے کے مطابق وہ تین ہزار ہیں، تین ہزار افراد جب یہاں سے گزریں گے تو وہ ان درختوں کے ہر طرف موجود ہوں گے اور ہم دیکھ لیے جائیں گے اور سب کے سب مارے جائیں گے ... اس سے یہ بہتر ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کریں ... اس میدان میں ان سے مقابلہ آسان ہوگا ... کھلے میدان میں وہ ہمارے نشانے پر ہوں گے جب کہ ہم پوری طرح درختوں کی اوٹ میں ہیں ... وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکیں گے یا آسانی سے نہیں بنا سکیں گے۔''

''میں کامران مرزا سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔'' چند لمحے کی

خاموشی کے بعد انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری۔

''اور میں بھی۔'' خان رحمان نے فوراً کہا۔

''اور خود میں اپنی تجویز واپس لیتی ہوں ... تعداد والا مسئلہ واقعی ٹیڑھا ہے۔''

''دے دو بھائی اسے واپس۔'' فاروق نے ہانک لگائی۔

''کیا دے دو۔'' پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔

''فرحت کی تجویز فرحت کو واپس دے دو۔''

''اوہ اچھا!'' پروفیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا۔

''ویسے تجویز بہت خوب تھی لیکن دشمنوں کی بڑی تعداد کی وجہ سے ہم اس پر عمل نہیں کر سکیں گے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

''شکریہ انکل!'' فرحت نے فوراً کہا۔

اچانک فرزانہ نے گھبرا کر کہا ... اس نے اسی وقت پھر زمین سے کان لگا کر رفتار اور فاصلے کا اندازہ لگایا تھا۔

''لگتا ہے رفتار بڑھا دی ہے۔''

''ہم پوری طرح تیار ہیں۔'' خان رحمان پر عزم انداز میں بولے۔

''کیا خیال ہے انکل، کیا اس جنگل میں ہم فتح یاب ہو سکیں گے۔''

''فتح اور شکست اللہ کے ہاتھ ہے ... مجھے تو یہ پتا ہے کہ ہمیں لڑنا ہے کیونکہ فریقِ مخالف ہمیں پکڑنا چاہتا ہوں اور بھون کر کھانا چاہتا ہے تو اس سے یہ لاکھ درجے بہتر ہے کہ ہم بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے

مارے جائیں۔''

'' آپ نے ٹھیک کہا انکل ، ہم سب لڑیں گے آخر دم تک لڑیں گے۔''فرحت نے بلند آواز میں کہا۔

اور پھر جنگلیوں کا شور سنائی دینے لگا۔

'' ہوشیار اور تیار ... میرے کہنے پر فائرنگ شروع کی جائے گی ... جمشید اور کامران مرزا تم دونوں جنگلیوں کے سردار کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا کیونکہ جونہی سردار مارا گیا یہ بھاگ کھڑے ہوں گے۔''

'' اچھی بات ہے ... ہم دونوں کی کوششیں یہی ہو گی۔''

انھوں نے خود کو پوری طرح درختوں کے پیچھے چھپا لیا۔

بس اپنی رائفلیں درختوں کے ساتھ اس طرح لٹکا دیں کہ آسانی سے نشانہ لے سکیں اور دشمن کو دیکھنے کے لیے سر تھوڑا سا آگے نکالنے کی تیاری کر لی ...

آخر دشمن انھیں آتا نظر آیا۔

فرزانہ کا اندازہ درست تھا۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی تین ہزار سے کم نہیں تھی۔

'' جنگلوں کی لڑائی میں حوصلہ قائم رکھنا سب اہم چیز ہے میرے دوستو ... یہ گوریلا جنگ کی طرح ہوتی ہے جہاں تعداد سے کہیں زیادہ اہمیت حکمت عملی اور چالبازی کی ہوتی ہے ... یہ تعداد کچھ بھی نہیں ... اگر ہم نے حوصلہ جوان رکھا تو ہم انھیں بھگا دیں گے ... اب میری ہدایت

کا انتظار کرو۔"

دشمن نزدیک آ رہا تھا اور وہ فائرنگ کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے لیکن خان رحمان کی اجازت کے بغیر وہ جنگ شروع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جنگوں کا جو تجربہ خان رحمان کا تھا وہ ان کا نہیں تھا۔

آخر انھوں نے کہا...

"فائر!"

اس کے ساتھ ہی انھوں نے تاک تاک کر ایک ایک فائر کیا۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے پہلے ہی جنگلیوں کے سردار کو دیکھ لیا تھا... ان دونوں نے ایک ساتھ اس کا نشانہ لیا تھا... وہ اچھل کر گرا... باقی تمام بھی نشانے پر لگیں... گولیاں کھا کھا کر جنگلی اچھل اچھل کر گرے اور پھر ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

وہ بدحواس ہو کر بھاگے۔

"بس اب فائر نہ کرنا... ان کا ردِعمل دیکھیں گے پہلے۔"

"جی اچھا! کیا ہم یہیں رکے رہیں۔" محمود نے پوچھا۔

"ہاں بالکل۔"

جنگلی کافی دور جا کر رک گئے کیونکہ انھوں نے محسوس کیا تھا... اس طرف سے پھر کوئی فائر نہیں ہوئے تھے... انھوں نے اپنے رخ تبدیل کر لیے... ان کی طرف مڑ کر کھڑے ہو گئے...

اب انھوں نے غور سے ان کا جائزہ لیا... وہ سیاہی مائل رنگ کی

قوم تھی۔ ان کے قد کافی لمبے تھے، جسم بہت چوڑے تھے۔ سروں پر انھوں نے پرندوں کے پروں سے بنائی گئی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، بھالے اور تیر کمان تھے۔

اب وہ سب ساکت کھڑے تھے... نیزوں کی انیاں دھوپ میں خوب چمک رہی تھیں۔ ان سب کے چہروں پر غم و غصہ تھا...

پھر وہ ایک ایک قدم آگے آنے لگے۔ ان میں سب سے آگے ایک جنگلی خالی ہاتھ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اس انداز میں اٹھائے ہوئے تھے جیسے کہہ رہا ہو:

''ہم جنگ نہیں چاہتے۔''

''یہ ہم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔'' خان رحمان بولے۔

''لیکن ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے، یہ ہماری نہیں سمجھتے، بات چیت کیسے ہو سکتی ہے بھلا۔'' پروفیسر بولے۔

''ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔''

پھر وہ شخص اکیلا ان کے بالکل نزدیک آگیا... جو ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا...

''میں انگریزی میں بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' خان رحمان نے کہا، پھر بلند آواز میں بولے: ''کیا چاہتے ہو۔''

وہ لگا ادھر ادھر دیکھنے... گویا وہ انگریزی نہیں سمجھتے تھے۔

''کیوں نہ میں سامنے چلا جاؤں اور اشاروں میں بات کروں۔''

'' ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں ۔'' انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری ۔

اب خان رحمان باوقار انداز میں درخت کے پیچھے سے نکلے اور اس کی طرف بڑھنے لگے ... پھر انہوں نے اشاروں میں کہا :

''ہاں کیا چاہتے ہو ... کیا بات کرنا چاہتے ہو ۔''

اس نے اپنے مردہ پڑے سردار کی طرف ہاتھ لہرایا اور اشاروں میں بتایا '' یہ ہمارا سردار تھا ، یہ تم لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے ، اب ہم تم لوگوں سے جنگ نہیں کریں گے لیکن تم میں سے ایک کو مجھ سے مقابلہ کرنا ہوگا ... میں اپنے قبیلے کا چھوٹا سردار ہوں لیکن اس قبیلے کا سردار صرف اس صورت میں بن سکتا ہوں جب سردار کے قاتل کو شکست دے دوں ... اگر میں تمھیں شکست دے دیتا ہوں تو یہ سب لوگ مجھے اپنا سردار مان لیں گے ۔'' یہاں تک کہہ کر اس نے اپنے اشارے بند کر دیے ۔

اس کے بعد خان رحمان نے اشاروں میں بات شروع کی ...

'' اور اگر تم جیت جاتے ہو تو ہمارا کیا بنے گا ۔''

اس نے بتایا :

'' تم لوگ آزاد ہو گے ... جہاں چاہو ، جاسکے گے ۔''

'' اچھی بات ہے ... میں اپنے ساتھیوں سے بات کرتا ہوں ۔''

خان رحمان یہ اشارہ کر کے واپس درختوں کے دوسری طرف آ گئے اور انھیں ساری بات بتائی ...

"تم یہ پوچھنا بھول گئے خان رحمان کہ اگر اس مقابلے میں جیت ہماری ہوئی تو کیا ہو گا۔"

"یہ بھی پوچھ آتا ہوں۔"

خان رحمان پھر اس کی طرف گئے ... اس سے یہ سوال پوچھا، اس نے جواب میں بتایا ...

"اس صورت میں قبیلہ جیتنے والے کو سردار مان لے گا۔"

"اس صورت میں جیتنے والا ہم لوگوں میں سے کسی کو سردار مقرر کر سکتا ہے اور ظاہر ہے ... وہ مجھے ہی کرے گا۔"

"لیکن اس کا اعلان کرے گا کون ...

"میں ... میں کروں گا اعلان ..."

"کیوں ...تم کیسے کرو گے ..."

کیونکہ میں نائب سردار بھی ہوں۔"

"کیا تم لوگ آدم خور ہو ... یعنی انسانوں کو کھا جاتے ہو۔"

"نہیں ہم آدم خور نہیں ہیں ... آدم خور ساتھ والے جنگل میں رہتے ہیں ...ہم تو خود ان سے تنگ ہیں کیونکہ وہ چپ چپاتے آتے ہیں اور ہمارے لوگوں کو اٹھا لے جاتے ہیں ... پھر ہمارے وہ ساتھی کبھی دیکھنے میں نہیں آتے۔" اس کے انداز میں دکھ تھا۔

"ان کا بھی انتظام کریں گے اگر آپ لوگوں نے ساتھ دیا۔"

"ٹھیک ہے۔"

اب وہ پھر اپنے ساتھیوں میں واپس آئے اور انھیں بتایا...

اس پر انسپکٹر جمشید نے کہا: ''اس صورت میں ہم مقابلہ کرنے کے لے تیار ہیں لیکن ہم ان پر اعتبار نہیں کریں گے کیونکہ ہو سکتا ہے اس بہانے یہ ہمیں گھیر لینے کے چکر میں ہوں۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے، یہ دھوکا نہیں دیں گے۔'' خان رحمان نے کہا۔

''خان رحمان تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو بھلا۔'' پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

''ہم ابھی تک پوزیشن لیے ہوئے ہیں ... پھر مقابلہ یہاں میدان میں ہوتا ہے ... ان حالات میں یہ ہم سے کیا دھوکے بازی کریں گے جب کہ ہمارا یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ... انھیں ہماری طرف سے خطرہ تو اس صورت میں ہوگا جب ہم یہاں ان پر سردار بن کر بیٹھ جائیں ... یہ اعلان میں پہلے ہی کر دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے خان رحمان، پہلے تم وضاحت کر دو۔''

خان رحمان ایک بار پھر میدان میں آگئے اور انھوں نے اشاروں کی زبان میں نائب سردار سے کہا:

''ہم اگر یہ مقابلہ جیت ہیں تو بھی ہمارا یہاں سردار بن کر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ... ہمیں تو یہاں سے آگے جانا ہے لہٰذا یہ جنگل اور ان لوگوں کی سرداری آپ کو مبارک ہو۔''

نائب سردار نے ان کی بات سمجھ لی اور بولا:

'' اس صورت میں تو مقابلے کی بھی کوئی ضرورت نہیں لیکن میری قوم نہیں مانے گی ... وہ چاہے گی میں مقابلے میں آپ کو شکست دوں تب ہی سرداری کا اہل سمجھا جاؤں گا ... لیکن اگر جیت نہ سکا تو پھر صورتِ حال اور ہو گی۔''

'' اور وہ کیا ؟ ''

'' میں جیت نہ سکا تو آپ کو ہی قبیلے کا سردار بننا پڑے گا اور آپ سرداری چھوڑ کر جا نہیں سکیں گے۔''

'' اوہ ... یہ شرط تو بہت کڑی ہے ... ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے ،ہمیں جانا ہے ... ہمارا وطن ہمیں پکار رہا ہے اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے وہاں ظلم وستم بڑھ رہا ہے ،عوام کا چین بہت مشکل ہو رہا ہے ، ہمیں ان لوگوں کے لیے جانا ہے۔''

'' ایک مسئلہ تو زبان کا ہے ... آپ ان سب کو کیسے سمجھا سکیں گے میں تو اشارے کی زبان جانتا ہوں ، اس لیے آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن ان لوگوں کو کیسے سمجھائیں ... البتہ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ آپ میرے ہاتھوں شکست کھا جائیں۔''

'' یہ ہم سے نہیں ہوگا ... یعنی جان بوجھ کر شکست کھانا۔''

'' تب پھر پہلے مقابلہ ہوگا ... پھر ... ''

ایسے میں فرزانہ چلاّئی: '' خطرہ۔''

سب چونک اِٹھے۔ وہ فرزانہ کی طرف مڑے۔

خان رحمان بھی پریشان ہو گئے۔ انھوں نے نائب سردار سے کہا:

''میں ابھی آیا۔''

''کیا ہوا فرزانہ۔'' انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کہا۔

فرزانہ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

''زمین میں بہت خوفناک دھمک ہو رہی ہے جیسے کوئی بہت بڑا لشکر چلا آ رہا ہو، لیکن اس طرف سے نہیں جس طرف سے یہ لوگ آئے ہیں بلکہ دائیں طرف سے آ رہا ہے۔''

''اوہ ... یہ کون سا لشکر آ گیا اب۔''

''کک ... کہیں یہ آدم خور کا لشکر نہ ہو۔''

عین اس وقت جنگلیوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلے۔

''ارے یہ کیا ہوا؟'' پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

''شاید آدم خوروں نے ان کی بستی پر حملہ کر دیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے بھی حملے کرتے رہتے ہیں، اصل صورتحال تو نائب سردار سے ہی معلوم ہو سکتی ہے ... تم سب یہیں ٹھہرو اور پوزیشن لیے رہو ... میں تنہا دوڑ کر نائب سردار تک جاتا ہوں ... اس سے معلوم کرتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' خان رحمان نے کہا۔

اور پھر انسپکٹر جمشید نے دوڑ لگا دی۔

وہ بلا کی رفتار سے اڑے جا رہے تھے۔

اس طرح آن کی آن میں وہ اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔

''کیا ماجرا ہے جلدی بتائیں۔'' انھوں نے اشارے میں پوچھا۔

نائب سردار نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا، پھر اشاروں میں کہا: ''آدم خور حملہ آور ہو رہے ہیں، آج ہم مارے جائیں گے۔''

''کیا مطلب ... کیا وہ پہلے بھی حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔''

''ہاں لیکن اپنی بستی میں ہم نے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں لیکن آپ لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم بہت دور آ گئے ہیں اور انھوں نے ہماری بو سونگھ لی ہے ... یہ لوگ بو سونگھنے میں بہت تیز ہیں، میلوں دور سے سونگھ لیتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا ... ہم اپنا معاملہ بعد میں طے کرتے رہیں گے۔''

''نہیں ... اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ لوگ نکل جائیں، جب آپ نہیں ہوں گے تو یہ لوگ مجھے خود ہی نائب سردار مان لیں گے۔''

''میں جا رہا ہوں ... کہیں آدم خور پہلے مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔''

پھر انھوں نے ساتھیوں کی طرف دوڑ لگا دی ... ساتھ ہی انھوں نے اپنا راستہ قدرے بدل دیا تاکہ سامنے سے آدم خوروں کے آنے کا کوئی امکان نہ رہ جائے ... بے تحاشہ دوڑتے ہوئے جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو آدم خور اس میدان میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے سردار پر فائرنگ کی تھی ... ان کے ساتھی خوف کے عالم میں

درختوں سے چمٹے ہوئے تھے کیونکہ وہ لشکر جنگلیوں سے بھی بڑا تھا اور ان کے ہتھیار بے تحاشہ تھے ... بندوقیں تو خیر ان کے پاس بھی نہیں تھیں لیکن دوسرے ہر قسم کے ہتھیار ان کے پاس بے تحاشہ تھے۔

خاص طور پر ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔

وہ بلا کا شور مچاتے ہوئے دوڑے جا رہے تھے۔

''میرا خیال ہے آج جنگلی ان کی زد میں آجائیں گے ... اپنی بستی تک نہیں جا سکیں گے کہ یہ ان تک پہنچ جائیں گے کیونکہ ان کی رفتار بہت زیادہ ہے جب کہ جنگلی قبیلے والوں کی رفتار کم ہے اور یوں بھی بہت زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا ہیں۔''

''یہ لوگ تو پھر مارے گئے۔'' خان رحمان نے کہا۔

''ایسا ہی لگتا ہے ... اگرچہ وہ بھی ہمارے دشمن ہیں لیکن ہمیں آدم خوروں کے مقابلے میں ان سے ہمدردی ہونی چاہیے۔''

''لیکن ابا جان ہم ایک اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں جن سے تین ہزار کا لشکر بھی خوف زدہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔''

''یہ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں ... کیوں اتنے خوف زدہ ہیں ... اس کی وجوہات ہوں گی ، آؤ چلیں ، کہیں ہمیں دیر نہ ہو جائے۔''

اب انھوں نے بھی آدم خوروں کے پیچھے دوڑ لگا دی ...

صورتحال اب یہ تھی کہ سب سے آگے جنگلیوں کا قبیلہ تھا۔ ان کے پیچھے آدم خور تھے اور ان کے پیچھے یہ لوگ ...

آخر ایک جگہ پہنچ کر انھیں رک جانا پڑا کیونکہ آگے انھیں آدم خوروں کا ایک بہت بڑا دائرہ نظر آرہا تھا...

"نہیں اس سے آگے جانا خطرناک ہو گا۔"

انسپکٹر جمشید نے دونوں بازو پھیلا کر انھیں رکنے کے لیے کہا۔

سب رک گئے۔ آدم خوروں کا حلقہ کافی دور تھا۔ وہ اگر مڑ کر ان کی طرف دیکھ لیتے تو بھی انھیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہاں گھنے درخت تو تھے ہی، جگہ جگہ گنجان جھاڑیاں بھی تھیں۔"

"آؤ خان رحمان مشورہ دو اب کیا کریں۔"

خان رحمان ان کے نزدیک آگئے ... اور بولے۔

"درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے ہمیں آگے جانا ہو گا ... اس حلقے کے قریب پہنچ کر درختوں پر چڑھ جائیں گے ... اس طرح ہم سب کچھ بہت صاف دیکھ سکتے ہیں۔"

"تجویز نہایت معقول ہے ... سب لوگ عمل کریں۔"

وہ درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنے لگے۔ ان کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ادھر پیچھے کی طرف دیکھنے کا ہوش کسے تھا۔

آخر وہ اوپر پہنچ گئے ...

اس وقت انھوں نے اپنی زندگی کا عجیب ترین منظر دیکھا ..

☆☆☆☆☆

ہولناک جنگ

چاروں طرف آدم خور دائرہ بنائے کھڑے تھے۔
جنگلی ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے۔ وہ سب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اب ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ موجود تھے۔
اس حلقے کے دوسری طرف جنگلیوں کے مکانات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا ... یہ مکان زیادہ تر شاخوں سے بنائے گئے تھے، ان کی چھتیں بھی لکڑی کی تھیں، اس سے بھی آتے دریا بہہ رہا تھا گویا ان کی پانی کی ضروریات دریا سے پوری ہوتی تھیں ...
درختوں پر عجیب وغریب قسم کے پھل بھی نظر آئے۔
یہ سب انھوں نے ایک نظر میں دیکھ لیا اور نظریں پھر حلقے کے درمیان آگئیں ...
ادھر آدم خوروں کا سردار ہاتھ میں ننگی تلوار لیے نہایت طیش کے عالم میں نائب سردار سے بات کر رہا تھا ... اس کی آواز چنگھاڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ... جب کہ نائب سردار ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور اس کی بات کا جواب دے رہا تھا ... اچانک اس نے اس سمت میں اشارہ

کیا جس طرف سے وہ سب آئے تھے ... نائب سردار کی ساری بات سن کر آدم خور کے سردار نے بلند آواز میں کچھ کہا ...

فوراً ہی تقریباً دو سو سوار حلقے سے نکلے اور اس سمت میں دوڑ لگا گئے جس طرف سے وہ آئے تھے۔

''پتا نہیں کیا ہو رہا ہے ... یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔'' پروفیسر داؤد نے الجھن کے عالم میں کہا۔

''میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔'' کامران مرزا کی آواز ابھری۔

یہ لوگ دبی آواز میں باتیں کر رہے ہیں ... تاہم درمیانی فاصلہ بھی اتنا تھا کہ آوازیں نیچے نہیں جا سکتی تھیں ...

پھر بھی وہ احتیاط کر رہے تھے۔

''چ لیے پھر آپ بتا دیں ... یہ کیا کر ہو رہا ہے۔''

''جمشید بھی سمجھ گئے ہیں۔''

''ہاں!'' وہ مسکرائے۔

''خیر میں بتاتا ہوں ... دراصل آدم خوروں کے سردار کی دشمنی جنگلیوں کے سردار سے ہے ... ان لوگوں کو گھیر لینے کے بعد انھیں سردار نظر نہ آیا ... اب وہ نائب سردار سے پوچھ رہے تھے بتاؤ تمھارا سردار کہاں ہے ... نائب سردار نے اسے بتایا کہ سردار مارا جا چکا ہے ... اس نے پوچھا وہ کیسے ... تب اسے ہمارے بارے میں بتانا پڑا۔ اب یہ جو دو سو افراد گئے ہیں ... یہ ہمیں پکڑنے کے لیے گئے ہیں۔''

'' بالکل یہی بات میں نے سمجھی ہے۔''

'' اور ہم انھیں وہاں ملیں گے نہیں۔''

'' ظاہر ہے وہ ناکام ہو کر لوٹ آئیں گے لیکن وہاں اس میدان میں انھیں سردار اور اس کے ساتھیوں کی چند لاشیں مل جائیں گی ... اس طرح نائب سردار کی بات کی تائید ہو جائے گی، اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

اور پھر تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ دو سو آدم خور سردار کی لاش کو اٹھا کے واپس آتے نظر آئے۔ حلقے میں داخل ہو کر انھوں نے سردار کی لاش کو آدم خور سردار کے قدموں میں پٹخ دیا۔

سردار نے نفرت بھری نظر اس لاش پر ڈالی پھر ایک زور دار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی۔

بلند آواز میں کچھ کہا اور وہ لوگ واپس جاتے نظر آئے ...

'' اس کا مطلب یہ ہے یہ معاملہ صرف سردار کا تھا، اس کے مارے جانے کے بعد ختم ہو گیا اور اب یہ لوگ واپس جا رہے ہیں۔''

'' تب پھر یہ سب لوگ اتنا کیوں ڈر رہے تھے ... ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آدم خور انھیں کھانے کے لیے اٹھا کر لے جائیں گے لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا''

'' ابھی نیچے اتر کر ان سے پوچھیں گے نا کہ کیا معاملہ ہے۔''

پھر آدم خور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اس وقت انسپکٹر جمشید نے آواز نکال کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جنگلیوں نے چونک کر درختوں کی طرف دیکھا۔ ان کے منہ مارے حیرت کے کھل گئے ... پھر انھوں نے انھیں نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سب نیچے اتر آئے۔

''یہ کیا ہوا ... ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''ہمارا سردار ان کا مطالبہ نہیں مانتا تھا ... آدم خوروں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ کم ازکم ایک نوجوان کو ہر روز ان کے حوالے کرے تاکہ وہ اسے بھون کر کھا جایا کریں ... سردار اس بات پر لڑ رہا تھا کہ ہم ایسا نہیں کریں گے اور اگر تم لوگوں نے زبردستی کی تو جنگ کریں اور پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا ... اس طرح کئی بار آدم خوروں نے ہم پر حملہ کیا لیکن ہم ہر بار خود کو بچا لیتے تھے کیونکہ اوپر سے نیچے والوں پر تیروں کی بارش آسان کام تھا، لیکن آج ہم ان کے گھیرے میں آگئے اور اس وقت کے حالات کو دیکھ کر میں نے یہ بات منظور کر لی کہ ہم ایک آدمی روزانہ انھیں دے دیا کریں گے۔''

''تو کیا تم لوگ دیا کرو گے۔''

''نہیں ... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''تب پھر انھوں نے کیسے یقین کر لیا۔''

''ہم نے انھیں تم لوگوں کے بارے میں بتایا ہے نا اور ثبوت کے طور پر بتایا تھا کہ تم لوگوں نے سردار کو مار ڈالا ہے اور یہ کہ ہمارے

ساتھیوں کہ لاشیں وہاں پڑی ہیں ... وہ لوگ یہ دیکھنے کے لیے وہاں گئے تھے اور سردار کی لاش کو اٹھا لائے تھے ... اب جب میں نے ان سے جان چھڑانے کے لیے ان کی شرط وقتی طور پر مان لی تو وہ تم لوگوں کی تلاش میں نکل گئے ہیں ، لیکن ظاہر ہے آپ ملیں گے نہیں کیونکہ آپ تو یہاں موجود ہیں ... لیکن وہ ناکام ہو کر پھر ادھر آئیں گے اور اپنا غصہ نکالیں گے۔''

'' پھر تم لوگوں کے لیے ان سے نجات حاصل کرنے کا آج بہترین موقع ہے ... ہم تمھارا ساتھ دیں گے اور ہمارے ساتھ ایک ماہر فوجی ہیں ... وہ تم لوگوں کے مورچے قائم کر دیتے ہیں ... اگر تم نے ان کی ہدایات پر عمل کیا تو بہت جلد ہم انھیں شکست دے دیں گے اور شکست کھا کر انھیں بھاگنے بھی نہیں دیں گے۔''

'' کیا ایسا ہو سکتا ہے۔''

'' ہاں کیوں نہیں ... ہم لوگوں کی زندگی ایسے ہی کاموں میں گزر رہی ہے ... ہم نے ان گنت جنگلیوں اور آدم خوروں سے ٹکر لی ہے۔''

''ہمیں کیا کرنا ہو گا ... مجھے ان سب لوگوں کو بھی سمجھانا ہو گا۔''

''خان رحمان تم انھیں اشاروں میں بتاؤ۔''

'' اچھی بات ہے۔''

اب خان رحمان انھیں ان لوگوں سے جنگ کا طریقہ اور تفصیلات بتاتے گئے ... آخر ان کے خاموش ہونے پر اس نے اپنے ساتھیوں کو

تفصیل سنائی اور ان سے پوچھا۔

''اب تم کیا کہتے ہو۔''

ان کا جواب سن کر نائب سرداران کی طرف مڑا:

''میرے ساتھی لڑنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ روز روز کی لڑائیوں سے ہم تنگ آئے ہوئے ہیں ... اگر ان کے خطرے سے ہماری جان چھوٹ جاتی ہے تو یہ سودا برا نہیں۔''

''بس ٹھیک ہے، تم لوگ ہتھیار سنبھال لو، ہم سب کو درختوں پر چڑھنا ہے، تمام تیر اور کمانیں لے کر، بھالے لے کر اور نیزے لے بھی ساتھ لے لو، ہم اپنے پستول اور رائفلیں لے کر اوپر چڑھیں گے اور سب سے آگے ہم ہوں گے ... درختوں پر ایک دائرے کی صورت چڑھیں گے ... وہ لوگ جب اس دائرے میں آجائیں گے تب حملہ شروع ہو گا اور تم لوگ دیکھو گے کہ بہت جلد دشمنوں کی لاشیں بکھری نظر آئیں گی ... ان میں سے بہت کم اپنی جانیں بچا کر بھاگ سکیں گے۔''

وہ سب ترکیب سن کر حیران رہ گئے کیونکہ درختوں کے اوپر دائرے کی صورت میں مورچہ بند ہونے کی ترکیب ان کے ذہنوں میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اب خان رحمان انھیں جلدی جلدی درختوں پر چڑھانے لگے۔

وہ اپنے تیروں اور نیزوں وغیرہ کے ساتھ اوپر چڑھتے چلے گئے۔

ان کیا مکانات اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا خان رحمان نے ایک خاص انتظام کیا ... ان کے گھر کے بھی دوسری طرف انھیں درختوں

پر چڑھا دیا ... انھیں ہدایات دی گئیں کہ وہ ان درختوں پر دم سادھے رہیں اور آواز وغیرہ بالکل نہ نکالیں۔

اب ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ سب جنگلی تو درختوں پر ہیں جب کہ ان کی عورتیں اور بچے گھروں میں ہی ہیں جبکہ ایسا نہیں تھا ... عورتیں اور بچے وہاں سے دور درختوں پر ہی تھے لیکن انھیں خاموش رہنا تھا اور جنگ میں حصّہ نہیں لینا تھا۔ ان تمام انتظامات کے بعد خان رحمان نے اپنے ساتھیوں کو سب سے اگلے درختوں پر مورچہ بند کیا۔ سب سے آخر میں خان رحمان ایک درخت پر چڑھے۔

ایک ایک درخت پر تین تین اور چار چار افراد چڑھ ہوئے تھے۔

اس طرح یہ میدانِ جنگ کافی لمبائی اور چوڑائی میں پھیل گیا تھا۔

اب انھیں دشمن کے انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا ...

انہیں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر آدم خوروں کے لشکر کو آتے دیکھ لیا ...

"ہوشیار اور تیار ... جب میں حکم دوں تب حملہ کرنا ہے جب وہ آ کر دائرے کے اندر رکیں گے کیونکہ اس سے آگے تم لوگوں کے گھر ہیں اور یہی وقت حملے کا ہو گا ... دشمن جب بھاگنے لگے تو ہم نیچے نہیں اتریں گے، سب کے سب درختوں پر ہی رہیں گے۔"

نائب سردار نے ان کی یہ ہدایت سب تک پہنچا دی ... اتنے میں حملہ آور اندھا دھند وہاں تک آ گئے اور خان رحمان کے عین اندازے

کے مطابق وہ لوگ اس دائرے کے اندر ہی آ کر رکے ... دائرے سے باہر کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا ... اس پر خود خان رحمان کے ساتھیوں کو بھی بہت حیرت ہوئی ... ابھی چاروں طرف گھوم گھوم کر یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہوئے ہیں کہ خان رحمان نے پہلا فائر کیا ... اس کے ساتھ ہی ان کے سب ساتھیوں نے فائرنگ شروع کر دی ... ساتھ ہی ان پر تیروں کی بارش شروع ہو گئی ...وہ بدحواس ہو کر بھاگے ... لیکن جس طرف سے بھاگے اس طرف انھیں سامنے سے تیر آتے نظر آئے ... وہ یہ سمجھے کہ دشمن اس طرف ہے ... لہٰذا انھوں نے اپنا رخ دائیں طرف کر لیا ...ادھر سے بھی سامنے سے تیر آتے نظر آئے تو ان کی بوکھلاہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔

اب وہ لوگ افراتفری کے عالم میں بائیں طرف تو اس طرف سے بھی نیزوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑا ، اس پر انھیں اور تو کچھ نہ سوجھی جنگلیوں کے مکانات کی طرف دوڑ پڑے ... وہاں بھی ان کے استقبال کے لیے خان رحمان کی حکمتِ عملی نے کام دکھایا۔

ادھر سے بھی ان گنت تیروں ان کی طرف آئے ... اب تو ان کی گھبراہٹ عروج پر پہنچ گئی ... انھوں نے ایک ساتھ ہی چاروں طرف دوڑیں لگا دیں اور اس دائرے سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے۔

ان حالات میں وہ خود تو کوئی تلوار چلا نہیں رہے تھے لہٰذا جنگلیوں کے دل ویسے ہی بہت بڑھ گئے تھے۔

انھوں نے تیر اندازی کی انتہا کر دی۔ آخر کار ان گنت لاشوں کو چھوڑ کر باقی لوگ دائرے سے نکل گئے۔ اب خان رحمان کا حکم یہ تھا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جائے لیکن یہ بات کچھ جنگلیوں کے دماغوں سے نکل گئی۔انھوں نے آدم خوروں کو بھاگتے دیکھا تو درختوں سے چھلانگیں لگا دیں۔

نائب سردار کو خان رحمان نے ایسے ہی وقت کے لیے ساتھ رکھا ہوا تھا انھوں نے فوراً اسے اشارہ کیا ...

نائب سردار نے چیخ کر ان سے کہا :

''یہ کیا کر رہے ہو ... خبردار درختوں پر رہو۔''

ان میں سے کچھ نے تو آواز سن لی اور عمل بھی کر لیا لیکن کچھ جوش میں آگے نکل گئے ...

'' افسوس یہ تو گئے کام سے ... ان کی تعداد اب بھی زیادہ ہے ... یہ ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے ... نائب سردار تم انھیں اب بھی روکنے کی کوشش کرو۔''

وہ چیختا رہ گیا لیکن وہ لوگ دائرے سے نکل چکے تھے۔

انھوں نے پلٹ کر نہ دیکھا... اب خان رحمان کی ہدایت یہ تھی کہ جب تک وہ حکم نہ دیں درختوں تک ہی رہنا ہے ... وہ انتظار کرنے لگے کہ کب انھیں حکم ملے اور وہ نیچے اتر کر فتح کا جشن منائیں لیکن خان رحمان بالکل ساکت بیٹھے تھے۔

انھوں نے کوئی حکم نہ دیا۔

اس پر کچھ جنگلیوں نے اپنے نائب سردار سے کہا:

''ابھی تم لوگوں کو درختوں پر ہی رہنا ہے۔''

''آخر کب تک؟'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''جب تک حکم نہ ملے۔'' نائب سردار نے ناخوش گوار لہجے میں کہا کیونکہ وہ اس وقت خان رحمان کی مہارت کا دل سے قائل ہو چکا تھا اور جان چکا تھا کہ انھوں نے جو یہ اتنی کامیابی حاصل کی ہے، صرف خان رحمان کی مہارت کے ذریعے حاصل کی ہے۔ ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی چپ سادھے بیٹھا رہا۔

اس طرح تین گھنٹے گزر گئے ... کچھ جنگلیوں نے چیخنا شروع کیا ... غالباً وہ کہہ رہے تھے: ''آخر ہم کب تک درختوں پر بیٹھے رہیں گے ... اور کیوں بیٹھے رہیں... آدم خور تو شکست کھا کر بھاگ چکے ہیں۔''

اب پھر نائب سردار نے خان رحمان کی طرف دیکھا۔

انھوں نے مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔

جواب میں نائب سردار بھی مسکرایا ... لیکن اس کے لوگ بہت بے چین تھے، پریشان تھے، کچھ دیر بعد تو بہت سے لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اب وہ بہت زیادہ غصّے میں آ چکے تھے لیکن سب نہیں ... ان میں سے بہت سے ... اور پھر ان میں سے کئی سو درختوں پر سے کود گئے یعنی انھوں نے حکم عدولی شروع کر دی۔

''یہ بہت برا ہوا... اگر اور لوگ کود گئے تو اور برا ہو گا ... انھیں سمجھاؤ ایسا نہ کریں اور واپس درختوں پر آجائیں۔''

نائب سردار نے انھیں پھر سمجھایا، لیکن انھوں نے ایک نہ سنی۔

ایسے میں فرزانہ نے چونک اٹھی ... اس نے چلا کر کہا۔

''دشمن آ پہنچا ... بہت دبے پاؤں آیا ہے، آواز پیدا کیے بغیر۔''

''اس لیے میں نے روک رکھا تھا ... اپنے لوگوں کو خبر دار کر دو۔''

نائب سردار نے چیخ کر انھیں خطرے سے خبر دار کیا۔ انھوں نے ہنس کر اس کا مذاق اڑایا، اوپر نہیں آئے اور پھر اچانک ان کی دل دوز چیخیں بلند ہوئیں ... دشمن کے تیر ان کے جسموں کے پار ہو چکے تھے ... اور پھر آدم خور واپس اس دائرے میں آگئے کیونکہ انھوں نے خیال کر لیا تھا کہ سب لوگ درختوں سے اتر آئے ہوں گے اور اپنے گھروں میں ہوں گے۔ ان کا رخ بھی سیدھا ان گھروں کی طرف ہی تھا۔

بس عین اس لمحے خان رحمان نے حکم دیا: ''حملہ کرو۔''

ان گنت تیر آدم خوروں کی طرف جا کر لگے ... درختوں پر بیٹھے لوگوں کیلئے انھیں نشانہ بنانا نہایت آسان کام ثابت ہوا...

ان میں ایک بار پھر بھگدڑ مچ چکی تھی ... خان رحمان پکارے:

''شاباش ساتھیو! اب یہ بچ کر نہ جانے پائیں ... ان کے پاؤں اکھڑ چکے ... یہ دل ہار چکے لیکن درختوں سے اب بھی نہ اترنا۔''

ان کے الفاظ نائب سردار نے اشاروں سے سمجھ لیے، چنانچہ اپنی

زبان میں دہرائے۔ وہ اور جوش سے تیر اندازی کرنے لگے۔ ان گنت آدم خور کھیت رہے، ان کے لیے بھاگنا ہی مشکل ہو رہا تھا، دائرہ بہت وسیع تھا اس طرح بہت کم لوگ جانیں بچا کر بھاگ سکے۔"

اب خان رحمان نے نائب سردار کے ذریعے حکم دیا:

"کود پڑو بہادرو ... اب یہ واپس مڑ کر تم پر حملہ کرنے کے قابل نہیں رہے ... دوڑتے رہو اور ان پر تیر چلاتے رہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ پھر درختوں سے اترنے لگے، کودنے لگے اور دشمن کا تعاقب کرنے لگے اور انھیں چن چن کر قتل کیا گیا۔

کئی گھنٹوں تک ان کا صفایا کرنے کا عمل جاری رہا۔

آخر آدم خوروں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔

واپسی پر انھیں ان جنگلیوں کی لاشیں ملیں جنھوں نے حکم نہیں مانا تھا اور درختوں سے اتر کر تعاقب شروع کر دیا تھا ...

دوسرے دن صبح سب لوگ میدان میں جمع تھے ... نائب سردار نے انھیں جمع کیا تھا کیونکہ انسپکٹر جمشید ان کے سامنے ایک تقریر کرنا چاہتے تھے ... جونہی انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی ان کے سامنے آئے۔

وہ سب کے سب ان کے سامنے سجدے میں گر پڑے ...

"ارے یہ کیا ... انھیں روکو یہ غلط ہے۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

نائب سردار کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ... اب انسپکٹر جمشید نے انھیں سمجھانے کی کوشش شروع کی کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک

اللہ ہے، ہم سب اس کی مخلوق ہیں اسی کے سامنے جھک سکتے ہیں۔‘‘

پھر وہ وہاں سے چل پڑے ... نائب سردار بھی ان کے ساتھ تھا بلکہ اب تو وہ باقاعدہ سردار بن چکا تھا ... ان کی وہاں سے روانگی سے پہلے جنگلیوں نے اسے اپنا نیا سردار تسلیم کر لیا تھا ... انہوں نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نا مانا اور اصرار کرتا رہا کہ وہ انہیں جنگل پار کروا کر ہی واپس لوٹے گا ... دو سو جنگلی بھی ان کی حفاظت کیلئے ساتھ ہو لیے۔

کئی روز مسلسل چلتے رہنے کے بعد آخر وہ اس خطرناک جنگل سے باہر نکل ہی آئے ...

ان کے پاس جو نقشے تھے، ان کے مطابق اب وہ اپنے ملک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے ایک ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد ان کے ملک کی حدود شروع ہونے والی تھیں۔

اس جگہ انھوں نے سردار کو الوداع کہا ...

جب وہ جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

○

تیسرے دن وہ اپنے ملک کی سرحد کے نزدیک پہنچ گئے۔

اس جگہ ان سب نے اپنے حلیے تبدیل کیے۔ اس کا انتظام وہ کر کے چلے تھے، اس لیے اس کام میں زیادہ دیر نہ لگی۔

اس وقت وہ جس جگہ موجود تھے وہ بھی گھنا جنگل تھا اور اس جنگل کے دوسری طرف بلند برفانی پہاڑ تھے۔

یہ برفانی پہاڑ ملک کی سرحد کا کام دیتے تھے لہٰذا اس طرف کوئی فوج مقرر نہیں تھی۔ دسمبر کے دن تھے ... سردیوں میں یوں بھی فوجیں یہاں سے ہٹا لی جاتی تھیں ... ان دنوں میں دشمن ملک بھی اپنی فوج ہٹا لیتا تھا ... یوں بھی اس طرف پورے ایک ماہ کے راستے تک جنگل ہی جنگل تھے اور انھیں جنگلوں کو عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ ان پہاڑوں کے دوسری طرف بھی پہاڑی لوگ آباد تھے اور وہ تھے بھی سب جنگجو ...اس لیے ان لوگوں کی موجودگی میں کسی فوج کو مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ... ان لوگوں نے یہاں پہاڑوں کے اندر سے راستے بنائے ہوئے تھے اور وہ ان راستوں سے ان جنگلات میں آتے رہتے تھے ... ان جنگلات سے وہ لکڑی کے علاوہ پھل اور دوسری چیزیں بھی مفت میں حاصل کر لیتے تھے ... ایک طرح سے وہ جنگل ان کی روزی کا ذریعہ تھے ...اسی شام انھوں نے پہاڑ عبور کر لیے اور اپنے ملک میں داخل ہو گئے ... احتیاطاً انھوں نے اسلحہ ہاتھ میں نہیں لیا تھا تاکہ قبائلی لوگ انھیں خطرناک نہ سمجھ لیں ... انھیں چلتے ہوئے ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ ایک سخت آواز نے ان کا استقبال کیا ...

"خبردار ... ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

☆☆☆☆☆

نئی حکومت

انھوں نے دیکھا ، چند پہاڑی لوگ ان کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ انھوں نے کوئی گھبراہٹ ظاہر نہ کی۔

انسپکٹر جمشید نے پر سکون آواز میں کہا : ''ہم دشمن نہیں دوست ہیں ... کیا آپ لوگ دیکھ نہیں رہے، ہم خالی ہاتھ ہیں ۔''

''ہاں ہم دیکھ رہے ہیں ... اپنی بات ثابت کریں ... آپ دوست کس طرح ہیں۔''

'' کیا ملک میں اس وقت کوئی اچھا آدمی حکومت کر رہا ہے ۔''

'' یہ کیا بات ہوئی ... کیا یہ آپ ثبوت پیش کر رہے ہیں۔'' ان میں سے سب سے اگلے آدمی نے کہا۔

'' ہم ثبوت کی ابتدا کر رہے ہیں'' انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے ۔

'' اس میں شک نہیں کہ تم لوگ بھلے مانس لگتے ہو ... خیر ہم بیٹھ کر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں ... لیکن خیال رہے کہ پوری طرح رائفلوں کی زد میں رہیں گے جب تک اطمینان نہیں کرا دیتے ہیں۔''

'' شکر گزار ہیں کہ آپ بات چیت کا موقع دے رہے ہیں۔''

اب انہیں ایک بڑے مکان میں لایا گیا۔

اس مکان کے جس کمرے میں انھیں لا کر بٹھایا گیا بہت لمبا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی کانفرنس ہال ہو۔ انھیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ پہلے ان کے سامنے قہوہ رکھا گیا۔

قہوے کے بعد ان کے سردار نے کہا :

'' ہاں اب بتائیں آپ لوگ کون ہیں اور اس طرف سے کیسے آ گئے ... اس طرف سے تو آج تک یہاں کوئی بھی نہیں آیا ... البتہ ہم جنگل میں اس طرف جاتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم جنگیوں کی جھلک بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن ہم نے اس سے آج تک الجھنے کی کوشش نہیں کی نہ انھوں نے کبھی ہمیں کچھ کہا ... دراصل وہ جانتے ہیں ساتھ والا ملک ہمارا ہے اور اگر وہ اس ملک کے لوگوں کو ساتھ کوئی گڑبڑ کریں گے تو ہم ان پر فوج لے آئیں گے ... بس اس خیال سے انھوں نے ہمیں کچھ نہیں کہا اور ہم نے بھی ان سے چھیڑ خانی نہیں کی۔''

'' ہم سمجھ گئے ... اب ہم اپنی بات کی طرف آتے ہیں ... کیا اس وقت ملک پر اچھے لوگوں کی حکومت ہے۔''

'' اس وقت ملک پر بدترین لوگ حکمران ہیں ... اس قدر ظلم وستم تو کل ساٹھ برسوں میں مجموعی طور پر نہیں ہوا تھا جتنا ان دو ماہ میں ہوا ہے... ملک پر اس وقت لوگوں سے زیادہ تتلیاں حکومت کر رہی ہیں ... لیکن آپ لوگ کون ہیں''

''ہم اپنے بارے میں ابھی تفصیل بتائیں گے ... پہلے آپ اسے حکومت کے بارے میں بتائیں۔''

''یہ اندھی حکومت ہے، ملک میں اندھا قانون رائج ہے، اسے لوٹ کھسوٹ کا دور کہہ سکتے ہیں، نہ دولت مند لوگ چین سے ہیں نہ غریب لوگ ... امیروں کی دولت لوٹی جارہی ہے غریبوں کی عزتیں لوٹی جارہی ہیں۔ اندھیر نگری ہے اندھیر نگری۔''

''اور خود آپ لوگوں کو کیا حال ہے۔''

''ہم چونکہ پہاڑوں میں رہ رہے ہیں، اس لیے اس سے محفوظ ہیں ... یوں بھی ہمارے پاس دولت تو ہے نہیں کہ لوٹنے کے لیے آئیں ... اس طرح ہم لوگ بہرحال محفوظ ہیں لیکن ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے... اس سے ہم بھی خوف زدہ ہیں ...کسی وقت حالات کے دھارے کا رخ ہماری طرف بھی ہوسکتا ہے۔''

''ملک کا کرتا دھرتا کون ہے یعنی کس کا حکم چل رہا ہے۔''

''کہنے کو تو ملک کا صدر سب کچھ ہے لیکن اصل حکومت اس کی نہیں تتلی کی ہے بلکہ تتلی ایجاد کرنے والے کی ہے، وہ جب چاہتا ہے ملک کے حصّے میں تتلی کے ذریعے تباہی مچا دیتا ہے، جس علاقے کے لوگ ذرا سا سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں وہاں تتلی پہنچ جاتی ہے اور پھر وہ ہولناک تباہی وہاں مچتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ان لوگوں کواس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کتنے آدمی مرتے ہیں۔''اس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

''آپ نے یہ نہیں بتایا صدر کون ہے۔''

''اس کا نام وجاہت میر سرفرازی ہے ... یہ غدار ہمارے پیارے صدر کا تھا ... آج یہ غدار صدر ہے ... ہمارے صدر بے چارے ایک چھوٹے سے ملک میں پناہ لیے ہوئے ہیں ۔''

''اور ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی وہاں پناہ لیے ہوئے ہیں۔''

انہوں اس خیال سے پوچھا کہ معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کے جذبات ان کے بارے میں کیا ہیں اور یہ کہ وہ انھیں جانتے بھی ہیں یا نہیں ۔''

''ہاں ! ان کے ساتھ ہمارے ملک کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ملک اور قوم کے لیے ہمیشہ خدمات انجام دیں ... ہم سب ان کے لیے بہت دکھی ہیں لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔''

''کیوں ... کر کیوں نہیں سکتے۔'' انسپکٹر جمشید مسکرا دیے ۔

''نہیں جناب پورے ملک کے لوگوں کا بس ایک ہی خیال ہے۔''

''اور وہ کیا ۔''

''نئی حکومت کے مقابلے میں ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے جب تک کہ تتلی کو تباہ کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے اور تتلی کے خلاف ابھی تک کوئی کچھ نہیں کر سکا ... ان حالات میں سب لوگ ان کو یاد کر رہے ہیں ... یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ایک بار وہ ملک میں آ جائیں تو ان تتلیوں کی تو وہ ایسی کی تیسی کر دیں گے ۔''

"خود آپ کیا پسند کریں گے ۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا ۔

"ہم لوگ تو ان کے لیے دعا کر رہے ہیں ، ان کے آنے کی دعائیں کر رہے ہیں ۔"

"اور اگر وہ آجائیں تو ۔"

"تو اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی ۔"

"تو پھر وہ آگئے ہیں ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

"کہاں آگئے ہیں ... کہاں ہیں وہ ۔"

"آپ کے سامنے ۔"

"یہ کیا بات ہوئی ... ہمارے سامنے تو آپ لوگ ہیں ۔"

"ہم اس وقت میک اپ میں ہیں ۔"

"یہ آپ لوگ ہیں یعنی انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی ۔" مارے حیرت کے وہ بولے ۔

"لیکن آپ تو بہت سارے ہیں یعنی تعداد میں ۔"

"انسپکٹر کامران مرزا پارٹی اور شوکی برادرز کو بھی بھیجا گیا تھا ۔"

"اوہ !!!" اس کے منہ سے نکلا ۔

اور پھر انسپکٹر جمشید نے اپنا چہرہ انھیں دکھا دیا ۔

وہ جوش میں بھر گئے ... ایک ساتھ چلا اٹھے ۔

"بہت خوب ! اب آئے گا مزہ ۔"

"آپ ہمیں یہاں رہنے دیں ... ہمیں ایک بڑی گاڑی کی بھی

ضرورت ہو گی تاکہ ہم اس میں گھوم پھر کر دارالحکومت جا کر حالات کا جائزہ لے سکیں اور اپنا کام کر سکیں ... ہمیں یہاں کئی بار آنا پڑے گا، کئی بار یہاں سے جانا پڑے گا ... آپ اتنا تعاون کرنے کیلئے تیار ہیں۔"

"آپ تعاون کی بات کر رہے ہیں ... ہم لوگ تو آپ پر جانیں نچھاور کر دیں گے۔"

"اللہ مہربانی فرمانے والے ہیں ... اگر بڑی گاڑی کا انتظام کرنا آپ کے لیے مشکل ہو تو ہم آپ کو رقم دے سکتے ہیں ... آپ ہمارے لیے گاڑی خرید کر لے آئیں۔"

"نہیں، ہم انتظام کر لیں گے، لیکن ہوگی وہ پرانی گاڑی البتہ کام ٹھیک آئے گی۔"

"ہمیں نئی گاڑی کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اس طرح تو ہم لوگ نظروں میں آ سکتے ہیں۔"

"بس تو پھر ہم آج ہی گاڑی کا انتظام کر لیں گے۔"

"اور یہاں تتلیوں کا کیا معمول ہے۔"

"فضا میں گردش کرتی رہتی ہیں ... سب لوگ ان سے خوف زدہ رہتے ہیں، جس جگہ کے لوگ ذرا احتجاج کرتے ہیں وہیں تتلی تباہی مچا دیتی ہے اور ایسا آن کی آن میں ہو جاتا ہے۔"

اور پھر اس رات وہ دارالحکومت کے گشت کے لیے نکلے۔

انہوں نے رات بھر چکر لگائے۔

اپنے گھروں کے آس پاس سے بھی گزرے اور پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ سے بھی۔ تجربہ گاہ کے اوپر کئی تتلیاں منڈلاتی نظر آئی۔

اسی طرح ان کے گھروں میں بھی تتلیاں مقرر تھیں۔

''پتا نہیں بے چارے اکرام وغیرہ کا کیا حال ہو گا۔''

''ہو سکتا ہے انہیں جیل میں ڈال دیا گیا ہو۔''

''ہم پروفیسر شنکی چانگ کی تجربہ گاہ کا بھی چکر لگا لیں، پھر واپس اپنے نئے ٹھکانے کی طرف چلیں گے، پھر پروگرام ترتیب دیں گے۔''

پروفیسر شنکی چانگ کی تجربہ گاہ پر بھی تتلیاں منڈلاتی نظر آئیں۔

''تمام خاص جگہوں پر تتلیاں موجود ہیں اور ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ پروفیسر صباری کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔''

''ہیڈ کوارٹر تلاش کرنا ہو گا۔'' محمود نے فوراً کہا۔

''ہیڈ کوارٹر کی تلاش۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''کیوں ... کیا ہے۔'' پروفیسر داؤد نے سے گھورا۔

''میرا مطلب ہے ... یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔''

''دھت تیرے کی۔'' آصف نے جھلا کر کہا۔

''پروفیسر صباری بہت چوکنا ہوگا، ہمیں اپنے انداز میں بات چیت نہیں کرنی چاہیے۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے خبردار کیا۔

''بات معقول ہے۔'' خان رحمان مسکرائے۔

اور پھر وہ دیہاتیوں کے انداز میں ادھر ادھر کی سیر سپاٹوں کی

باتیں کرنے لگے ... پورے شہر کا چکر لگا کے بعد وہ واپس اپنے نئے ٹھکانے پر آگئے اور اب وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے ...

''ہیڈ کوارٹر تلاش کیے بغیر کام نہیں بنے گا۔'' پروفیسر بولے۔

''ہم اس بات پر غور کر سکتے ہیں کہ دارالحکومت میں یا دارالحکومت سے باہر اس کے آس پاس کون سی جگہ پر اس کا ہیڈ کوارٹر ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''کیوں نہ ہم اس خیال کے تحت کوشش کر لیں۔'' کامران مرزا نے کہا۔

''اور وہ کیا ؟''سب ایک ساتھ بول پڑے ۔

''اس سازش کے پیچھے جو دماغ کام کر رہا ہے ، اس نے بھی تو اس پر غور کیا ہوگا ۔''انسپکٹر کامران مرزا نے پر خیال انداز میں کہا ۔

''جی ... کس بات پر؟''آصف نے فوراً کہا۔

''اس بات پر کہ اس کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہونا چاہیئے ۔''

''تو پھر۔'' وہ ایک ساتھ بولے ۔

''آخر وہ کس نتیجے پر پہنچا ہو گا۔''

''بھلا ہم کیسے جان سکتے ہیں۔'' آفتاب بیچارگی کے عالم میں بولا۔

''عقل کے ذریعے ۔''انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے ۔

''تو ہم اپنی عقلوں سے گھوڑے دوڑا لیتے ہیں۔''فرحت نے کہا ۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

سب سوچ کے سمندر میں ڈوب گئے اور عقل کے گھوڑے دوڑانے لگے ... آخر کافی دیر بعد وہ اس سمندر سے باہر نکلے ...

''ہاں کسی کے دماغ میں کوئی ترکیب آئی ؟'' خان رحمان نے سب پر ایک نظر ڈالی ۔

'' ایک عدد ترکیب ڈرتے ڈرتے آئی تو ہے میرے دماغ میں۔'' فرزانہ نے کہا ۔

''اسے ڈرتے ڈرتے دماغ میں آنے کی کیا ضرورت پڑگئی تھی۔'' فرحت نے حیران ہو کر کہا ۔

'' تمھارا دماغ ہے یا کوئی ڈریکولا ...'' آصف پٹ سے بولا ۔

'' دماغ کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔'' محمود نے اعتراض کیا ۔

'' فرزانہ کے دماغ سے کہیں وہ ترکیب نکل نہ جائے۔'' انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا ۔ '' پہلے ترکیب سن لیتے ہیں۔''

'' چلیے یونہی سہی ۔'' فاروق کی شوخ آواز گونجی ۔

'' اب یونہی سہی کی ٹانگ اڑا دی ، ہے کوئی تک۔'' آفتاب نے منہ بنایا ۔

'' تک تو تمھارے اس جملے میں نہیں ہے ۔'' فاروق جھلا کر پلٹا ۔

''بس بس میں نے کہا نا ۔''انسپکٹر جمشید نے تیز آواز منہ سے نکالی۔

'' جج ... جی اچھا ۔''فاروق گھبرا گیا ۔

'' میری طرف سے بھی جج ... جی اچھا ۔'' آفتاب مسکرایا۔

''یار چپ رہو ... ترکیب اگلو فرزانہ ۔''پروفیسر داؤد بھنا گئے۔

''پروفیسر صبّاری کے سازشی ذہن نے جب ایجاد پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا ہو گا تو لازمی طور پر یہ بھی سوچا ہو گا کہ ہیڈ کوارٹر کہاں بنائے گا ... یہ سوال اس کے لیے بہت اہم ہو گا یا پھر ...' فرزانہ یہاں تک کہہ کر رک گئی ۔

'' یا پھر کیا ... درمیان میں رکنا ضروری ہے کیا ۔'' آصف جھلاّ اٹھا۔

''نہیں، بس ایسے ہی شوق ہے درمیان میں رکنے کا۔'' محمود نے منہ بنایا ۔

'' اب وہ ترکیب بتا رہی ہے تو تم پھر درمیان میں بول پڑے۔'' شوکی نے گویا انہیں خبردار کیا ۔

'' اوہ معاف کرنا۔''

'' پہلے کر چکا ہوں ۔''شوکی جل گیا ۔

'' تو پھر میں نے بھی پہلے ہی شکریہ ادا کر دیا ہوگا ۔''

'' دیکھا آپ نے ۔''فرحت چلاّ اٹھی ۔

'' نہ صرف دیکھا بلکہ سنا بھی ... اب یہ خاموش ہو جائیں ، صرف فرزانہ کو بات کرنے کی اجازت ہے ۔'' انسپکٹر جمشید چڑ کر بولے۔

'' دھت تیرے کی ۔'' محمود نے جھلاّ کر اپنی ران پر ہاتھ مارا ۔

'' تم نے سنا نہیں محمود ! انکل نے کیا کہا ہے ۔'' آفتاب غرایا ۔

'' اور تم جو بول رہے ہو۔''مکھن کہاں خاموش رہنے والا تھا ۔

''توبہ ہے تم سب سے۔'' پروفیسر داؤد بھنا کر بولے۔
پھر یک لخت خاموشی چھا گئی ... اس پر فرزانہ نے کہا۔
''اللہ کا شکر ہے ... اب سنیے پروفیسر صباری کے ساتھ اگر کچھ اور سازشی لوگ ہیں ... تب انھوں نے ضرور کسی خاص جگہ ہیڈ کوارٹر قائم کیا ہو گا اور وہاں آلات نصب کیے ہوں گے ... ورنہ تو ان کے لیے سب سے بہترین ہیڈ کوارٹر خود پروفیسر شنکی چانگ کی تجربہ گاہ ہی تھی ... آلات وہاں پہلے ہی نصب تھے ... کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔''
''لیکن اس تجربہ گاہ پر تو اسی وقت حکومت نے قبضہ کر لیا تھا'' آصف نے اعتراض کیا۔
''تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے ... قبضہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے اس عمارت کو سیل کر دیا تھا اور باہر دو چار نگرانی کرنے والے بٹھا دیئے ہوں گے۔ اندر تو تجربہ گاہ جوں کی توں موجود رہی تھی اور اس میں آسانی سے کام جاری جا سکتا تھا ... بعد میں تو تتلی حکومت کے احکامات شروع ہو گئے تھے ... کہنے کا مطلب یہ کہ ہیڈ کوارٹر کی تلاشی میں نکلنے سے پہلے ہمیں اس تجربہ گاہ کو چیک کر لینا چاہیے۔''
''میں فرزانہ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔
''اب سوال یہ ہے کہ ہم اس تجربہ گاہ کو اندر سے کیسے دیکھیں۔''
''کوئی پرواہ نہیں ... فاروق سے کام لیں گے۔''

'' ارے باپ رے۔'' فاروق کانپ گیا۔

'' بس نکل گئی جان۔'' آفتاب نے منہ بنایا۔

'' جان کا کیا ہے، بیچاری تو نکلتی ہی رہتی ہے۔'' فاروق مسکرایا۔

'' آج رات ہم یہ کام کر گزریں گے ... ہمارے پاس خاص قسم کے پستول ہوں گے اور خاص قسم کی گولیاں ہوں گی۔'' خان رحمان پرجوش انداز بولے۔

'' لیکن ... اس طرح تو پروفیسر صباری ہوشیار نہیں ہو جائے گا ... فاروق نے کہا۔

'' ہم اپنے پستولوں کو اس وقت تک نہیں آزمائیں گے جب تک شدید ضرورت نہ محسوس کر لیں۔''

رات وہ اپنے ٹھکانے سے باہر نکلے ... ان کا رخ پروفیسر شنکی چانگ کی تجربہ گاہ کی طرف تھا ... رات کی تاریکی میں یہ سفر آسانی سے ہوگیا، کسی نے انھیں نہ روکا، عجیب بات انھوں نے یہ محسوس کی تھی کہ اب چوراہوں پر کوئی پولیس مقرر نہیں تھی ... دن میں جب وہ گھوم پھر رہے تھے، کہ پولیس اب چوراہوں پر نہیں ہے ... البتہ سڑکوں کے سگنل کام کر رہے تھے اور لوگ ان کی خوب پابندی کر رہے تھے ... بس اتنا تھا کہ سروں پر تتلیاں ضرور گشت کر رہی تھیں۔

گویا لوگ ان تتلیوں کے خوف سے کوئی غلط کام نہیں کرتے تھے۔

انھوں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ... وہ یہ تھیں کہ ملک کا صدر

سرفرازی اب سیاہ اور سفید کا مالک تھا ، وہ جو چاہتا تھا حکم دے دیتا تھا۔ کوئی چوں بھی کرتا تو تتلیاں اسے دھمکانے کے لیے آ جاتی تھیں۔

اس طرح پورا ملک خوف کی لپیٹ میں تھا۔ٹیکس حد درجے زیادہ کر دیے گئے تھے ، سرکاری چیزوں کے نرخ بے تحاشہ بڑھا دیے گئے تھے ... یہ لوگ نہ چیخ سکتے تھے ، نہ چلا سکتے تھے۔ کوئی ذرا بھی احتجاج کرتا تو تتلی اس پورے علاقے پر منڈلاتی نظر آتی تھی اور کئی جگہ پر تو تتلیوں نے قیامت خیز تباہی مچائی بھی تھی۔ ان کی تباہیوں کو دیکھ کر لوگ اس قدر سہم گئے تھے کہ کسی میں دم مارنے کی جرات نہیں رہی تھی۔

بڑے بڑوں نے دم سادھ لیے تھے۔ حکومت کے مطالبے پورے کیے جا رہے تھے۔ لوگ موت کی حد تک تنگ آ چکے تھے لیکن کچھ بھی کر سکنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

ان حالات میں لوگ اللہ سے کسی نجات دہندہ کی دعائیں کرتے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کو بھی بے تحاشہ یاد کر رہے تھے۔ یہ حالات ان پہاڑی لوگوں نے بیان کیے تھے کیونکہ وہ ضروریات زندگی خریدنے کے لیے دوسرے تیسرے دن شہر میں آتے تھے۔ خود ان کی زندگی بھی بے حد مشکل ہو چکی تھی۔ آمدنی کے ذریعے وہی تھے۔ آمدنی میں تو ذرا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا جب کہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اکثر جگہوں پر تو بھوک سے اموات بھی ہوئی تھیں ... لیکن تتلی حکومت کو کسی کے مرنے پر کوئی دکھ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

تجربہ گاہ پہنچ کر انہوں نے آس پاس کے علاقے کا چکر لگایا۔

وہاں کوئی نگران موجود نہ تھا۔

صدر دروازے پر بھی ایک عام سا تالہ لگا ہوا تھا اور اسے سیل بھی نہیں کیا گیا تھا۔

یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے کہا: ''فاروق تمھاری جان چھوٹ گئی۔''

انسپکٹر جمشید نے اپنے طریقے سے تالا کھول ڈالا لیکن وہ فوراً ہی اندر داخل نہیں ہو گئے۔ دروازہ کھول کر ادھر ادھر پوزیشن لینے کے انداز میں کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر انسپکٹر جمشید نے ایک روڑا اٹھا کر اندر پھینک دیا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی لیکن اندر کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکا۔

''پہلے صرف میں اندر جاتا ہوں۔''

اور پھر وہ اندر چلے گئے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔ ان کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

''اندر کوئی نہیں تھا، تجربہ گاہ بالکل اسی دن کی طرح پڑی ہے۔''

وہ اسی وقت اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔

اب انہوں نے اپنے شہر کا نقشہ پھیلا لیا... یہ نقشہ بہت تفصیلی اور بڑا تھا... شہر کے ایک ایک مقام کی نشان دہی کی گئی تھی... وہ سب ایسے مکانات کا غور سے جائزہ لینے لگے... وہ اس نقطہ نظر سے جائزہ لے رہے تھے کہ شہر میں پروفیسر صباری کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہو سکتا ہے۔

وہ غور کرتے رہے اور نقشے پر نشانات لگاتے رہے۔

آخر کافی غور وفکر کے بعد انھوں نے تین جگہیں طے کر لیں۔

ان کے خیال میں ہیڈ کوارٹر ان تین جگہوں میں سے کسی ایک جگہ میں ہوسکتا ہے اور یہ تینوں جگہیں پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔

ان تینوں جگہوں پر نہ پہنچنا آسان تھا نہ ان جگہوں پر حملہ کرنا آسان تھا لیکن ایک بات صاف تھی کہ ہیڈ کوارٹر اگر ہوسکتا تھا تو ان تین ہی میں سے کسی ایک جگہ پر ہوسکتا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ ان جگہوں کو صرف دن کی روشنی میں چیک کیا جا سکتا تھا، رات کی تاریکی میں تو اپنی ہڈی پسلی ایک کرنے والی بات تھی۔

اور پھر وہ اپنی گاڑی پر ان میں سے ایک پر روانہ ہوئے۔

ان کے لباس بھی پہاڑی لوگوں جیسے تھے ... ڈھیلے ڈھالے، ظاہر میں ان کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی ... یوں لگتا تھا جیسے وہ تفریح کے لیے نکلے ہوں۔

پہلے مقام پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اتر گئے اور پیدل پہاڑوں پر گھومنے پھرنے لگے۔ ادھر گئے ادھر گئے لیکن وہاں کوئی بندہ نظر آیا نہ بندے کی ذات۔ کوئی عمارت نام کی چیز بھی نہیں تھی۔ پہاڑی لوگوں کے ٹوٹے پھوٹے، کچے پکے کچھ مکانات ضرور تھے۔

"اگر ان کا ہیڈ کوارٹر یہاں ہوتا تو یہ گھر نہیں ہوسکتے تھے ... لہٰذا یہ وہ جگہ نہیں ہوسکتی ... اب کل دوسری جگہ چیک کریں گے۔"

"آج ہی کیوں نہ دیکھ لیں۔"

"نہیں ... یہ پروگرام اب کل۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ واپس پہنچے تو ان کے سیدھے سادے میزبانوں نے ان کے لیے کھانا تیار کرایا ہوا تھا۔

کھانا کھا کر پروفیسر داؤد بولے: "کھانے تو ہم نے بہت قسم کے کھائے ہیں، ماہرین کے ہاتھوں کے کھائے ہیں ... یہاں تک کہ ہماری بھابھی صاحبہ یعنی جمشید کی بیگم صاحبہ بہت لذیذ کھانے بنانے کی ماہر ہیں ... ان کے کھانے کھا کر بھی ہم انگلیاں چاٹ کر رہ جاتے ہیں لیکن جو مزہ آج کھانے کا آیا ہے وہ شاید ہمیں پہلے کبھی نہ آیا ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آپ روزانہ تکلف کریں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ... ہمارے مہمان بازار سے کھانے کھائیں ... یہ تو ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے ... کھانا تو اب آپ کو یہاں ہی کھانا پڑے گا۔"

عین اس لمحے دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔

"معاف کیجیے گا۔" سردار خان نے چونک کر کہا۔

سردار خان اٹھ کر چلا گیا ... کچھ دیر بعد واپس اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا: "ایک شخص کچھ بکریاں خریدنے آیا ہے ... میں اسے فارغ کر کے آتا ہوں۔"

"تو یہاں لوگ بکریاں خریدنے بھی آتے ہیں۔"

'' آتے تو نہیں ... ہم خود ہی اپنے جانور شہر کی منڈی میں لے جاتے ہیں ... مہینے دو مہینے بعد ہمارا اس سلسلے میں چکر لگتا ہے لیکن یہ صاحب تو ابھی کچھ ہی دنوں سے آنے لگے ہیں ... آتے ہیں اور آتے ہی دس بکریاں خرید کر لے جاتے ہیں۔''

'' اوہ اچھا۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

سردار خان چلا گیا۔

کھانے کے بعد بڑے ایک طرف بیٹھ گئے چھوٹے دوسری طرف۔

ایسے میں فرزانہ نے فرحت کے کان میں کچھ کہا

جواب میں فرحت مسکرائی ...پھر دونوں باہر جانے لگیں۔

'' کہاں چل دیں ، کوئی نئی بات سوجھ گئی کیا ؟ '' آصف نے مذاق اڑانے والے انداز لہجے میں کہا۔

دونوں اس طرف مڑیں ... مسکرا کر دیکھا اور ایک ساتھ بولیں ۔

'' نئی بات نہیں ایک پرانی بات سوجھ گئی ہے ، واپس آکر بتائیں گی کہ کیا بات سوجھی تھی ۔''

''جاؤ جاؤ۔'' محمود نے منہ بنایا اور ساتھ میں ہاتھ بھی نچایا ۔

''جا ہی تو رہی ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔'' فرزانہ نے بھنا کر کہا اور دونوں کمرے سے نکل گئیں ۔

'' یہ کسی شرارت کے چکر میں نکلی ہیں۔'' آصف نے منہ بنایا ۔

'' خیر ، ہم باہر نکل کر دیکھ لیتے ہیں کیا کر رہی ہیں تاکہ ہم وقت

سے پہلے ان کی شرارت کا گلا گھونٹ دیں ۔'' محمود نے کہا۔

'' یہ ٹھیک رہے گا ۔''

سب ایک ساتھ بول اٹھے اور پھر جلدی سے باہر نکل آئے۔

فرحت اور فرزانہ وہاں نہیں تھیں ...

☆☆☆☆☆

عمارت کے سوراخ

''حیرت ہے ... یہ دونوں تو اس طرح غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔'' مارے حیرت کے محمود نے کہا۔

''تمھارے خیال میں ... انہیں کس طرح غائب ہونا چاہیے تھا۔'' شوکی مسکرایا۔

''ہے کوئی تک۔'' محمود نے شوکی کو تیز نظروں سے گھورا۔

''بالکل نہیں ہے۔'' آصف نے فوراً کہا۔

''میرے خیال میں ہم آج ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہیں۔'' محمود بوکھلا اٹھا۔

''کس بات کا۔'' آصف نے پوچھا۔

''بے تکی باتوں کا۔'' محمود نے فوراً کہا۔

''شوکی نے بے تکی بات کی ابتدا کی تھی ورنہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ کیا دونوں کا اس طرح غائب ہو جانا حیرت کی بات نہیں۔''

''حیرت کی بات تو ہے لیکن دوسروں کو حیران کرنا بھی ان دونوں کی خاص عادت ہے۔''

''آؤ دیکھتے ہیں شیطان کی یہ خلائیں کہاں کھسک گئیں ہیں۔''
اب انھوں نے ان دونوں کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کیں۔
''حیرت ہے کمال ہے افسوس ہے۔'' محمود بڑبڑایا۔
''ہوگا ...ہمیں کیا!'' آفتاب مسکرایا۔
''آخر وہ دونوں ہمیں نظر کیوں نہیں آ رہیں۔'' محمود نے پریشانی کے عالم میں کہا۔
''شاید اسے کہتے ہیں ... آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔'' مکھن بڑبڑایا۔
''نہیں اسے ہرگز آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل نہیں کہتے۔'' محمود جھلا کر اس کی طرف پلٹا۔
''تو پھر ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا کہتے ہیں۔'' آصف نے کہا۔
''محاورات کی ٹانگیں نہ توڑو۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔
''ارے آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔''
انھوں نے سردار خان کی آواز سنی۔
وہ چونک اٹھے۔ وہ نہ جانے اچانک کس طرح سامنے آ گیا تھا۔
''آپ اس طرح اچانک کس طرح سامنے آ گئے۔'' مارے حیرت کے محمود نے کہا۔
''یہ بائیں طرف چٹان نظر آ رہی ہے نا، اس کے پیچھے سے نکل آیا ہوں۔''
''اور آپ کا وہ گاہک؟''

''وہ بکریاں لے گیا، میں ادھر آ گیا۔ اس چٹان کے دوسری طرف ہماری بکریاں کا باڑہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''آپ نے اس قدر جلد سودا طے کر دیا۔''

''وہ پہلے بھی آتا رہتا ہے نا، پھر قیمت پر کوئی جھگڑا نہیں کرتا، جتنے پیسے کہو فوراً دے دیتا ہے ... اس وقت اس نے پانچ بکریاں کہا تھا دینے کے لیے ... میں اچھی اچھی پانچ بکریوں کی رسیاں کھولیں اور اس کے ہاتھ میں تھما دیں ... جتنے پیسے میں نے کہے وہ اس نے دیئے اور بکریوں کو لے کر چلا گیا۔''

''لیکن بکریاں اس کے ساتھ اس قدر آسانی سے کیسے چلی گئیں۔''

''وہ ایک چھوٹی سی گاڑی پر آتا ہے، اس گاڑی کے پیچھے سامان لادنے کی جگہ ہے، اس پر لاد کر لے جاتا ہے۔''

''اوہ اچھا ...''

''اور آپ لوگ یہاں ... سب خیر تو ہے نا ...''

''بس یونہی باہر نکل آئے تھے ... دراصل ہماری بہنیں گھومنے کے لیے نکل گئی ہیں انہیں دیکھ رہے تھے ... آپ کو تو نظر نہیں آئیں۔'' محمود نے جلدی جلدی کہا۔

''نہیں میں نے تو انہیں نہیں دیکھا۔'' یہ کہہ کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس میں بڑے موجود تھے ...

اس کے جانے کے بعد محمود نے کہا: ''آؤ اس چٹان کے دوسری

طرف دیکھتے ہیں ، ہمیں تنگ کرنے کے لیے یہیں کہیں چھپ گئی ہیں ۔"

"ہم بھی انہیں اتنا ہی تنگ کریں گے جتنا وہ ہمیں کریں گی۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

چٹان کے دوسری طرف انھیں بے شمار بکریاں نظر آئیں۔

وہ گھاس چر رہی تھیں ... وہ ان بکریوں کے پاس سے گزر کر دوسری طرف آگئے۔ وہاں ایک پتلی سی سڑک تھی۔

اس سڑک پر کافی دور ایک چھوٹی سی گاڑی چلی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے بکریاں بھی لدی ہوئیں تھیں۔

انہوں نے سڑک پر اور سڑک کے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن فرزانہ اور فرحت دور دور تک نظر نہ آئیں۔

"ارے یہ دونوں تو واقعی ہی غائب ہوگئیں۔"

"اب کیا کریں ، انہیں کہاں تلاش کریں ۔"

"خود ہی آ جائیں گی ، ہم کیوں ان کی تلاش میں دبلے ہوں۔"

"بات معقول ہے ۔"

اور وہ واپس اندر آگئے ... بڑی پارٹی نے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا تو محمود نے کہا ۔

"ہم ذرا فرزانہ اور فرحت کو دیکھنے نکل گئے تھے ... پتا نہیں وہ کہاں چلی گئی ہیں ۔"

"جائیں گے کہاں ... یہیں ہوں گی۔"

''ہم نے انھیں ہر طرف دیکھ لیا ہے۔''

''اوہو اچھا ... انہیں آواز دو، بلند آواز میں پکارو۔''

''جی اچھا۔''

وہ ایک بار پھر باہر آگئے ... اب محمود نے انھیں پکارا۔

''فرزانہ، فرحت ...تم کہاں ہو۔''

اس نے دو تین بار منہ کی مختلف سمتوں میں کر کے آواز نکالی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید وغیرہ بھی نکل آئے۔

اب انھوں نے بھی ان دونوں کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

اب تو وہ سب پریشان ہو گئے ... ادھر ادھر دوڑ پڑے لیکن ان کا پھر بھی کوئی سراغ نہ ملا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''جی کیا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''بتائے بغیر وہ کہاں جا سکتی ہیں۔''

''اس بات پر تو ہم حیران ہیں۔''

''ارے ہاں سردار خان ... جو آدمی بکریاں لے گیا ہے، وہ کہاں سے آتا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے چونک کر پوچھا۔

''یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا لیکن اس طرف سے آتا ہے۔''

''آؤ بھئی چلیں ...'' یہ کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

جلد ہی وہ اس طرف چلے جا رہے تھے رخ پر بکریاں خریدنے والا اپنی گاڑی پر گیا تھا۔

''کیا آپ کے خیال میں وہ شخص انھیں اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن اس کے آنے کے بعد ہی دونوں کمرے سے نکلی تھیں۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

ان کا سفر جاری رہا اور پھر ...

مارے حیرت کے اچانک انسپکٹر جمشید نے بریک لگا دیے ...

ان کے منہ حیرت زدہ انداز میں کھلے کے کھلے رہ گئے ... فرحت اور فرزانہ پرسکون انداز میں چلی آ رہی تھیں ...

''حد ہو گئی ، یہ سیر سپاٹے کرتی پھر رہی ہیں اور ہم ان کی خاطر پریشان ہو رہے ہیں۔'' محمود نے جل بھن کر کہا ۔

''نزدیک آنے دو ، لیتے ہیں خبر ۔'' آصف نے سرد لہجے میں کہا ۔

''آپ میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔'' فاروق پلٹا ۔

''پہلے ان سے پوچھ تو لیں یا ایسے ہی گرجنے برسنے لگ جائیں۔''

جلد ہی وہ دونوں ان کے قریب آ پہنچیں:

''فرزانہ فرحت ، یہ سب بہت پریشان ہو گئے تھے اس لیے اب ان کی پریشانی غصے میں بدل گئی ہے۔''

''ابھی ان کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔'' فرزانہ مسکرائی ۔

''بلکہ بادلوں کی طرح اڑ جائے گا۔'' فرحت مسکرائی۔

''ایسا کیا تیر مار آئی ہو۔''محمود نے انھیں گھورا۔

''جس تیر کو مارنے کی اس وقت ہمیں شدید ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہم نے ہیڈ کوارٹر کا سراغ لگا لیا ہے۔''

''کیا مطلب، کیسے لگا لیا، کہاں ہے وہ۔''

''اب تین ٹھکانوں میں سے تیسرا، جن میں سے ہم ایک کا جائزہ لے چکے ہیں۔''

''یعنی باقی ... وہ ایک ٹھکانہ ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔'' مارے جوش کے انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

''ہاں ... ہم دونوں نے نقشے بغور دیکھے تھے اس لیے ہم یہ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہیں ...''دونوں ایک ساتھ بولیں۔

''لیکن تم نے کیسے تلاش کر لیا۔''

''اس شخص کا تعاقب کر کے جو بکریاں لینے کے لیے آیا تھا ... ہمیں خیال آیا تھا ... اگر ہیڈ کوارٹر یہیں ہے اور اس کو انہوں نے نہایت ہی خفیہ رکھا ہوا ہے تو اس میں کھانے پینے کا سامان بھی خفیہ طور پر آتا ہو گا ... ویسے تو ان کیلئے خوراک کا انتظام کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کیونکہ ان ہی کی تو حکومت ہے ... لیکن اس کے باوجود حالات سے ایسا ہی ظاہر ہے کہ ہیڈ کوارٹر کا علم گنتی کے ہی لوگوں کو ہے ... اور اگر سب

ہی کچھ اتنا ہی خفیہ ہے تو خوراک کا سامان بھی خفیہ طور پر ہی آتا ہو گا ... اور خوراک وہاں منگوانے کی بجائے خوراک حاصل کرنے کے لیے ان گنتی کے لوگوں کو خود ہی باہر نکلنا پڑتا ہو گا۔ ساتھ میں خیال آیا کہ کہیں یہ بکریوں کے سلسلے میں آنے والا شخص وہیں سے تو نہیں آیا۔ بس ہم اس طرف چل پڑی ... ابھی اس نے بکریاں خریدی بھی نہیں تھیں کہ ہم اس سے آگے نکل گئیں، لیکن ہم چٹانوں وغیرہ کی اوٹ لے کر آگے جا رہی تھیں، گاڑی ہمارے پاس سے گزری اور ہم نے اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ ہم اس ٹھکانے تک پہنچ گئیں، وہ وہاں وہ گاڑی موجود تھی اور اس پر بکریاں جوں کی توں موجود تھیں۔''

''تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہاں وہی لوگ موجود ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے یعنی تتلیوں کے ذمے دار۔'' آصف نے بھنا کر کہا۔

''ہم دونوں عقل سے پیدل نہیں۔'' فرحت پرسکون آواز میں بولی۔

''تمھارا مطلب ہے ہم لوگ عقل سے پیدل ہیں۔'' محمود بھنا گیا۔

''ہم نے یہ تو نہیں کہا۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''ان پر غصہ نہیں کرنا چاہیے، تعریف کرنی چاہیے ... ہاں فرزانہ فرحت بتاؤ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ وہاں وہی لوگ موجود ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے۔''

''اس عمارت کے حالات دیکھ کر۔'' فرحت نے مسکرائی۔

''اور وہ حالات کیا ہیں۔'' فاروق دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

”پہلے یہ بتاؤ تم ہمیں گھور کیوں رہے ہو۔“ فرزانہ چنچنائی۔

”ہاں پہلے یہ بتاؤ تم ہمیں گھور کیوں رہے ہو۔“ فرحت بولی۔

”بیٹھے بٹھائے ہیرو بن گئیں اور ہم گھوریں بھی نہ۔“ آفتاب نے جھلا کر کہا۔

”فرزانہ جلدی بتاؤ ... مارے بے چینی کے ہمارا برا حال ہے۔“

”اس جگہ ایک عمارت ہے ... وہ عمارت بہت پرانی ہے لیکن اس کی دیواروں میں جو سوراخ بنائے گئے ہیں ، ان سوراخوں کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی البتہ ۔“فرزانہ کہتے کہتے رک گئی۔

”البتہ کیا ؟“

”ایسے سوراخ قلعوں کی دیواروں میں ضرور نظر آئے ہیں اور وہ اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان میں سے رائفلوں کی نالیں گزاری جاتی ہیں یعنی دشمن حملہ کر دے تو ان کے ذریعے فائرنگ کی جا سکتی ہے ۔“

”تمھارا مطلب ہے اسی قسم کے سوراخ اس عمارت کی دیواروں میں نظر آ رہے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔

”جی ہاں ۔“

”تب تو پھر ہم بھی اس عمارت کو دیکھنا پسند کریں گے ۔“

وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ آخر پندرہ منٹ بعد وہ اس عمارت کے پاس سے گزر رہے تھے ... وہ پہاڑوں کے نزدیک تھی اور قدرے نشیب میں تھی ، اس تک جانے کے لیے ایک پتلی سڑک بھی موجود تھی۔

'' اوپر اوپر سے نکل جائیں ... یا عمارت پر جانے والی سڑک پر اتر جائیں ۔'' خان رحمان نے پوچھا ... وہی گاڑی چلا رہے تھے۔

'' اس طرح انہیں شک گزر سکتا ہے۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

'' لیکن میرے پاس ایک ترکیب ہے۔'' مکھن بول اٹھا۔

'' ضرور کیوں نہیں۔''

'' یہاں گاڑی خراب ہونے کا بہانہ کیا جا سکتا ہے یا ٹائر پنکچر ہونے کا، اس طرح ہمیں گاڑی سے نیچے اترنا پڑے گا اور ہم ٹہلنے کے انداز میں اس طرف جائیں گے۔''

'' یہ ترکیب اچھی ہے۔''

'' ٹھیک ہے جمشید ... یوں بھی جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر ۔'' خان رحمان مسکرائے۔

'' واقعی ان موسلوں سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

'' اور سو بار کر چکا ہے تو ہماا امتحان ۔'' فاروق نے ہانک لگائی۔

'' بھئی ذرا اپنی آوازوں پر کنٹرول رکھو ... اصل آواز منہ سے نہ نکالو۔'' انسپکٹر جمشید نے وارننگ دی۔

'' جی اچھا ... اب آواز بلند نہیں ہوگی۔'' فاروق سہم گیا۔

'' اور سہمنے کے لیے تمھیں کس نے کہا ۔'' آفتاب نے اسے گھورا۔

'' سہمنے کے لیے کسی کا کہنا ضروری نہیں۔'' فاروق ہنسا۔

اور پھر اچانک ٹائر پھٹنے کی آواز گونجی ... انسپکٹر کامران مرزا نے محمود کے چاقو کے ذریعے کام دکھایا تھا... گاڑی میں اسپیئر وہیل لگانے کا سامان موجود تھا۔ یوں بھی یہ جگہ ان کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہیں تھی، وہ پیدل واپس جا سکتے تھے۔

ٹائر پھٹنے کا دھماکا زور دار تھا۔

''دھماکے کی آواز ضرور عمارت تک پہنچ ہوگی ... اب ہمیں بوکھلاہٹ کی ایکٹنگ کرتے ہوئے نیچے اتر جانا چاہیے، میں اور کامران مرزا ٹائر لگاتے نظر آئیں گے ... باقی لوگ ادھر ادھر گھومنے کے انداز میں اس عمارت تک ہو آئیں بلکہ پینے کے لیے ان سے پانی بھی مانگ سکتے ہیں، اس طرح اور زیادہ قریب سے عمارت کا جائزہ لے سکیں گے۔''

اب اس ترکیب پر عمل شروع ہوا۔

اس طرح باقی لوگ ادھر ادھر گھومنے لگے اور آخر گھومتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھنے لگے ... پہاڑی دیہاتیوں کے روپ میں تھے۔ فی الحال انھیں کوئی خطرہ تو تھا نہیں ...

بس بے دھڑک وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔

عمارت کے باہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی ان کے نزدیک جانے پر کوئی باہر نکلا۔ اس طرح وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے ...

''کیا خیال ہے، دستک بھی دے لی جائے۔''

''ہاں جب یہاں تک آ گئے ہیں تو پانی تو ان سے مانگ ہی سکتے

ہیں ... پینے کے لیے بھی اور گاڑی کے لیے بھی۔''

انہوں نے دیکھا عمارت بالکل سرخ رنگ کی تھی ... ان اطراف میں پہاڑ بھی سرخ رنگ ہی کے تھے، گویا یہ عمارت پہاڑوں کے رنگ میں رنگی نظر آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پرانے زمانے کی عمارت ہو جب لوگ تلواروں اور نیزوں پر جنگ کرتے تھے۔

یہ قلعہ نما عمارت اسی دور کی یاد دلاتی تھی۔

محمود نے آگے بڑھ کر دستے پر ہاتھ سے دستک دے ڈالی کیونکہ وہاں کوئی گھنٹی کا بٹن نہیں تھا نہ دروازے پر کسی کے نام کی تختی تھی۔

دستک دیے تین منٹ گزر گئے لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

اب محمود نے قدرے زور دار انداز میں دستک دی۔

آخر قدموں کی آواز سنائی دی۔

ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔

پھر دروازہ کھلا اور وہی شخص نظر آیا جو بکریاں لینے آیا تھا۔

''کیا بات ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی ... انداز نرم تھا۔

''ہماری گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا ہے ... ٹائر لگنے کے انتظار میں ہم گھومتے ہوئے اس طرف آگئے ... دراصل ہمیں محسوس ہوا تھا کہ یہ کوئی تاریخی عمارت ہے، کیا یہی بات ہے ... ویسے ہمیں کچھ پانی کی بھی ضرورت ہے ... کچھ اپنے لیے کچھ ریڈی ایٹر میں ڈالنے کیلئے۔''

''ہاں یہ بہت پرانی عمارت ہے لیکن ہمیں زیادہ معلومات نہیں،

ہمارے بڑوں نے اسے خریدا تھا، آپ ٹھہریں، میں آپ کو پانی لا دیتا ہوں لیکن آپ پانی کس چیز میں لے جائیں گے۔'' اس نے کہا۔

انہیں احساس ہوا کہ انہیں دیہاتی سمجھ کر وہ اپنے گلاسوں میں انہیں پانی دینے سے ہچکچا رہا تھا... وہ مسکرا کر رہ گئے۔

''آپ کوئی بڑی بالٹی دے دیں... ہم واپس لا دیں گے۔''

وہ اندر چلا گیا... جلد ہی ایک بڑے ڈول میں پانی لے آیا۔

''شکریہ، آپ اندر تشریف لے جائیں، ہم پانی وہیں لے جاتے ہیں، آپ کا برتن ابھی دے جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں، آپ برتن دروازے پر رکھ کر چلے جایئے گا، میں اٹھا لوں گا۔'' اس نے کہا۔ لہجہ اب بھی ناخوش گوار نہیں تھا...

وہ پانی اٹھا کر سڑک تک آ گئے۔

پانی پینے کے دوران محمود نے دبی آواز میں اپنے والد اور انسپکٹر کامران مرزا کو بتایا: ''وہی شخص باہر آیا تھا جس نے بکریاں خریدی تھی، اس کا کہنا ہے یہ عمارت ان کے بڑوں نے خریدی تھی...بس اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''ٹھیک ہے ہم آج رات کو اس عمارت کا اندر سے جائزہ لیں گے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''جب کہ...'' فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

''یہ تم میں بہت بری عادت ہے، بات کو درمیان میں چھوڑ دیتے

ہو۔'' آصف نے بھنا کر کہا۔

'' دراصل یہ سسپنس پیدا کرنے کا طریقہ ہے۔'' فاروق مسکرایا۔

'' اچھا اب اگلو بھی ... کیا کہنے چلے تھے۔''محمود نے منہ بنایا۔

'' چلا کہاں تھا، یہیں رہ کر بات کرنے چلا تھا۔'' فاروق مسکرا دیا۔ اس کے ساتھ بڑے بھی مسکرانے لگے جبکہ باقی چھوٹے برے برے منہ بنا رہے تھے۔

'' جب کہ میرے خیال میں اس عمارت میں داخل ہونا بہت ہی مشکل کام ثابت ہوگا ... عمارت قلعہ نما ہے ... پھر اس کی دیواروں میں جو چاروں طرف سوراخ نظر آ رہے ہیں وہ خطرے کی گھنٹی ہیں۔''

'' کیا کہا، سوراخ خطرے کی گھنٹی ہیں۔'' خان رحمان نے کہا۔

'' جی ہاں انکل ... میں نے ایک خاص بات نوٹ کی ہے۔''

'' اللہ کا شکر ہے۔'' شوکی خوش ہو گیا۔

فاروق نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر اس نے کہا ...

'' میں نے یہ خاص بات نوٹ کی ہے کہ سوراخ عمارت کی دیوار وں میں پہلے نہیں تھے بنائے گئے ہیں اور انھیں بنائے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

''کیا ٹائر لگ چکا ہے۔''

'' ہاں بس کام ختم ہونے کے قریب ہے، تم میں دو جاؤ اور برتن وہاں رکھ آؤ، اب سب کا جانا ٹھیک نہیں۔''

''ہم برتن رکھ آتے ہیں ، آؤ آفتاب ۔''فاروق نے کہا۔
آفتاب اس کے ساتھ ہو لیا... دونوں بالکل خاموش تھے۔
آخر وہ عمارت کے دروازے پر پہنچ گئے۔
اب آفتاب نے بھی ان سوراخوں کو ایک نظر دیکھا اور دل ہی دل میں فاروق کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ اس سب نے اس بات کو نوٹ نہیں کیا تھا، صرف فاروق نے کیا تھا۔
برتن دروازے پر رکھ کر وہ واپس مڑے۔
واپسی پر ان کے دل اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگے...
وہ یوں محسوس کر رہے تھے کہ عمارت سے ان کی طرف اب گولیاں برسائی گئیں کہ جب...
لیکن خیریت ہی رہی اور پھر باقی لوگوں انہیں سامنے نظر آنے لگے۔
فاصلہ اب بھی کافی تھا لیکن انہوں نے سکون کا سانس لیا۔
لیکن عین اس لمحے انھوں نے ایک بہت ہی عجیب آواز سنی۔

☆☆☆☆☆

ترکیب

انہوں نے اپنے سر اوپر اٹھا کر دیکھا ... لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا۔
''تم نے آواز سنی تھی آفتاب؟'' فاروق نے سرگوشی کی۔
''ہاں اس لیے کہ میں بہرہ نہیں۔'' وہ مسکرایا۔
''اللہ کا شکر ہے ... پھر اس آواز کے بارے میں کیا خیال ہے۔''
''میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا۔''
''مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یہ آواز پہلے بھی سن رکھی ہے۔'' اس کی آواز سے حیرانی ٹپک رہی تھی۔
ان کی رفتار بڑھ گئی ... پھر وہ سڑک کے کنارے پر پہنچ گئے۔
باقی لوگ پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے ... وہ بھی بیٹھ گئے۔
انسپکٹر جمشید نے گاڑی آگے بڑھا دی ... انھوں نے اسی جگہ سے اسے واپس نہیں موڑا تھا ... ورنہ عمارت میں موجود لوگ شک کرتے ... چکر کاٹ کر وہ گھر پہنچے۔
''ہاں اب کہو فاروق۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔
''پہلی بات تو میں بتا چکا ہوں کہ سوراخ نئے ہیں، پرانے نہیں

یعنی یہ بات نہیں کہ پرانے زمانے کے قلعوں کی طرح رائفلوں کے لیے یہ سوراخ بنائے گئے ہوں ، یہ تو ابھی دو تین ماہ پہلے بنائے گئے ہیں۔''

''اس کے علاوہ ...''

''وہ آواز تو آپ نے بھی سنی ہو گی۔''

''ہاں وہ ہم نے نوٹ کی تھی ... بہرحال ہم ذرا میزبان سے بھی اس بارے میں بات کر لیں ...آفتاب تم جا کر انھیں بلا لاؤ۔''

''جی اچھا۔''

جلد ہی میزبان ان کے ساتھ بیٹھا تھا ...

''ہم آپ کے پڑوس میں موجود ایک قلعہ نما عمارت کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں ، وہ سرخ رنگ کی عمارت ، کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔''

''دائیں طرف والی پہاڑیوں میں گھری سرخ عمارت ؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی ہاں !'' انھوں نے جواب دیا۔

''یہ عمارت بھوت بنگلے کے نام سے مشہور ہے لیکن سنا ہے آج کل اس میں کچھ لوگ آ کر آباد ہو گئے ہیں۔''

''کیا آپ کو پتا نہیں سردار خان کہ آپ سے جو شخص بکریاں خرید کر لے جاتا ہے وہ اسی عمارت سے آتا ہے'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''اوہو اچھا یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی ، بہت بکریاں کھاتے ہیں یہ

لوگ ، دو ہفتے میں ایک بار آ جا تا ہے اور پانچ چھ بکریاں خرید کر لے جاتا ہے ، لگتا ہے بکری کے گوشت کے بہت شوقین ہیں۔''

'' کیا آپ نے ان لوگوں کی آمد سے پہلے عمارت کی دیواروں میں سوراخ دیکھے ہیں ۔''

'' سوراخ ! '' اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا ۔

'' ہم آپ کو اس عمارت تک لے جاتے ہیں ، کیا آپ اسی وقت چل سکتے ہیں۔''

'' اچھی بات ہے ۔''

اور پھر وہ سردار خان کو ساتھ لے کر اس طرف روانہ ہوئے۔ عمارت کے نزدیک جانے سے پہلے ہی انسپکٹر جمشید نے گاڑی روک دی اور سردار خان کو پیدل اس عمارت کے سامنے لے گئے۔

پہلے جس جگہ انھوں نے اپنی گاڑی روکی تھی بس اسی مقام سے انھوں نے سردار خان کی توجہ دلائی اور پوچھا :

'' اب آپ غور سے دیکھیں کیا آپ کو عمارت کی دیواروں میں ہر سوراخ پہلے سے نظر آئے ۔''

اس نے حیرت بھری نظروں سے ان سوراخوں کو دیکھا ، پھر بولا ۔

'' حیرت ہے کہ یہ ان دیواروں میں اتنے سوراخ کیسے بھر گئے اور کیوں ... یہ ضرور کوئی جناتی جگہ ہے ، فوراً واپس چلیں ، میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔''

وہ واپس روانہ ہو گئے ... کچھ فاصلے پر آنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ سردار خان کا خوف قدرے کم ہو گیا۔

چنانچہ انھوں نے پوچھا: ''ہاں سردار خان ... آپ کا ان سوراخوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''یہ سوراخ پہلے دیواروں میں نہیں تھے ...''

''اوہ ...تو فاروق کا خیال درست تھا۔''

''کیا مطلب ؟''

''فاروق نے دیواروں میں وہ سوراخ دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دیواروں میں نئے بنائے گئے ہیں، پہلے کے نہیں ہیں جیسا کہ قلعوں کی دیواروں میں رائفلوں کی نالوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

واپس لوٹ کر انسپکٹر جمشید نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''اندازہ یہی ہے کہ ان کا ہیڈ کوارٹر یہی ہے یعنی تجربہ گاہ سے تتلیوں کا ذخیرہ یہاں لایا گیا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے ان سب پر ایک نظر ڈالی۔

''اس لیے جو قدم اٹھانا ہے سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

''آپ نے جو مختلف دھاتوں والا تجربہ کیا تھا ... کیا اسے نہیں آزمائیں گے۔''

'' ہمارا پورا انحصار ہی اسی تجربے پر ہے ... اگر وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اچانک ہمارے ہاتھ میں ایک طاقت آ جائے گی اور ان کی کمر ٹوٹ جائے گی اور اگر تجربہ ناکام ہو گیا تو پھر ہمارے لیے مشکلات کے پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے۔''

'' اگرچہ یہ میرا کام نہیں لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا ہے ایک تجویز دے ہی دوں۔'' اخلاق نے جیسے ڈرتے ڈرتے کہا۔

'' تم دو گے تجویز ... '' آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔

''ہاں تمہارا دور کا بھی تعلق نہیں تجویز سے۔'' فاروق بولا۔

'' بری بات ... اسے کہنے دو۔''

'' اچھا بھائی کہو۔''محمود نے منہ بنایا۔

''ہمیں اپنی بنائی ہوئی گولی کو آزمانا ہو گا ... لیکن ساتھ ہی ان کے اڈے کی نگرانی کرنی ہوگی ... میرا مطلب ہے... ہم شہر میں کسی تتلی کو نشانہ بنائیں گے اور ردِعمل یہاں دیکھیں گے ... یعنی یہ دیکھیں گے کہ یہاں کیا ہوتا ہے ... اس کے بعد شاید ہم خود ہی جان لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' یہاں تک کہہ کر اخلاق خاموش ہو گیا۔

'' یہ تم نے ترکیب بتائی ہے۔'' فرزانہ ہنسی۔

'' بالکل بھونڈی ترکیب ...'' فرحت بول اٹھی۔

اخلاق کا سر شرم سے جھک گیا ... ایسے میں انسپکٹر جمشید نے کہا۔

'' میرے خیال میں ان حالات میں یہ بہترین ہے۔''

'' ہائیں انکل ... یہ آپ نے کیا کہا۔''

'' سچی بات یہ ہے کہ میرے دماغ میں بھی یہی ترکیب آئی تھی۔'' انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

'' اوہو اچھا!'' مارے حیرت کے پروفیسر داؤد نے کہا۔

اور پھر اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ اسی ترکیب پر عمل کیا جائے۔

'' پھر ہمیں دو پارٹیوں میں تقسیم ہونا پڑے گا۔'' خان رحمان نے گویا اپنا فیصلہ سنایا۔

'' ایک پارٹی انسپکٹر کامران مرزا کی قیادت میں کام کرے اور دوسری پارٹی انسپکٹر جمشید کے ماتحت ...'' پروفیسر نے فوراً کہا۔

'' بالکل ٹھیک ... کامران مرزا والی پارٹی عمارت کے آس پاس موجود ہوگی اور ان کے پاس اپنی بنائی ہوئی گولیوں سے بھرے پستول ہوں گے ... جمشید والی پارٹی شہر جائے گی اور جہاں تتلیاں گردش کرتی نظر آئیں گی اس علاقے میں اپنا تجربہ کرے گی ... انسپکٹر جمشید سب سے پہلے ایک تتلی کو نشانہ بنائیں گے، اگر تتلی تباہ ہو گئی تو باقی بھی تتلیوں کو نشانہ بنائیں گے۔ کامران مرزا والی پارٹی صرف عمارت میں ہونے والے ردِعمل کو نوٹ کرے گی... پھر دوسری پارٹی بھی یہیں آجائے گی اور عمارت کے خلاف سب مل کر قدم اٹھائیں گے۔'' خان رحمان ایک ہی سانس میں کہتے چلے گئے۔

'' تجویز معقول ہے، اگر ہمارے ہتھیار نے تتلیوں کو تباہ کر دیا تو

ان لوگوں کے ہوش تو ویسے ہی اڑ جائیں گے ، ان کی اصل طاقت تتلی ہے ، تتلی کے ذریعے تباہی مچانے کا خوف پیدا کر کے انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کیا ہے ... جب وہ دیکھیں گے کہ تتلی تباہ ہو گئی ہے تو حواس باختہ ہو جائیں گے ... ان کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی۔"

پروفیسر داؤد نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔

"انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ پروفیسر داؤد ، آصف ، آفتاب ، اشفاق اور فرحت رہیں گے ، باقی میرے ساتھ چلیں گے اور ہم رات کو گیارہ بجے چلیں گے ... دوسری پارٹی بھی رات کو گیارہ بجے عمارت کے آس پاس پہنچ جائے گی ۔" انسپکٹر جمشید نے اعلان کیا۔

"ٹھیک ہے ، یہ پروگرام طے رہا۔" کامران مرزا نے کہا۔

رات کے ٹھیک گیارہ بجے دونوں پارٹیاں گھر سے روانہ ہوئیں ... انسپکٹر کامران مرزا پارٹی کو پیدل عمارت تک جانا تھا کیونکہ فاصلہ بہت تھوڑا تھا ، جب انسپکٹر جمشید پارٹی گاڑی میں روانہ ہوئی۔

شہر کی ایک مشہور اور بلند عمارت کے اوپر چند تتلیاں چکر لگاتی نظر آئیں۔ وہ ان کو دیکھ کر رک گئے ...

"بس یہیں ٹھیک ہے ... ہمیں اپنا تجربہ یہیں کرنا ہو گا ۔"

"بہت بہتر ۔" شوکی بولا۔

"آج تم سب کے نشانے کا امتحان ہے ، لیکن پہلے میں ایک تتلی کو نشانہ بناؤں گا ، اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا تو ساتھ ہی تم فائر کرو گے۔"

''بالکل ٹھیک ، اللہ نے چاہا تو ہمارے نشانے درست لگیں گے۔''

انھوں نے ایک مناسب سی جگہ تلاش کی۔

انسپکٹر جمشید کی ٹیم میں سات لوگ تھے جبکہ تتلیاں چھ تھیں۔

''آفتاب تم فائر نہیں کرو گے ... ہاں اگر شوکی کا نشانہ خطا ہو گیا تو اس صورت میں تم فوراً ہی فائر کر دینا۔''

''جی بہت بہتر۔'' وہ مسکرا دیا۔

اب انھوں نے پوزیشنیں لے لیں ...

اس وقت انسپکٹر جمشید نے انسپکٹر کامران مرزا سے رابطہ کیا اور بولے: ''ہم فائر کرنے کے لیے تیار ہیں ... پروفیسر صاحب سے کہیں اپنے آلات ریڈی کر لیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور آپ سب لوگ بھی عمارت پر نظریں بٹھا دیں۔''

''ہم نے نظریں جما دیں ہیں۔'' کامران مرزا نے جواب دیا۔

''احتیاطاً میں وائرلیس بند کر رہا ہوں ، فائرنگ کے فوراً بعد میں رابطہ کرنے کے قابل رہا تو آن کروں گا۔''

''ٹھیک ہے اور میں سننے کے قابل رہا تو سنوں گا۔'' انسپکٹر کامران مرزا ہنس دیے۔

اور پھر وہ سب تیار ہو گئے۔ انھوں نے پہلے اللہ کو یاد کیا، پھر تتلیوں کو نشانے پر لے لیا۔

تتلیاں بدستور گردش کر رہی تھیں ...لیکن رفتار زیادہ نہیں تھی ...

سب سے پہلے انسپکٹر جمشید نے فائر کیا ... فائر بے آواز تھا۔

گولی تتلی کو لگی ... چنگاری جیسی چڑ چڑ کی آواز سنائی دی اور تتلی نیچے گرتی صاف نظر آئی۔

انسپکٹر جمشید کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ... وہ سب بھی جوش میں بھر گئے ... یہ بہت بڑی کامیابی تھی ... ان کا حربہ کامیاب ہو گیا تھا ... پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے تتلی پر فتح پائی تھی ... ملک سے نکلنے سے پہلے بھی انہوں نے تتلی کو نشانہ بنایا تھا اور شکست ان کا مقدر بنی تھی لیکن اس بار پروفیسر داؤد کا یہ نیا حربہ کام کر گیا تھا ...

تتلی کی تباہی کا صاف مطلب یہ تھا کہ دھاتوں پر کیے گئے ان کے تجربے رنگ لے آئے تھے۔ پروفیسر داؤد کی سائنس کامیاب رہی تھی۔

بس پھر کیا تھا ... باقی ساتھیوں نے بھی فائر کر دیے اور باقی پانچ تتلیاں بھی چکر کھاتی نیچے گرتی نظر آئیں۔

انسپکٹر جمشید نے ان سب سے مخاطب ہو کر کہا: ''مبارک ہو۔''

فوراً ہی کامران مرزا کا وائرلیس آن کر کے کو سگنل دیا۔

ادھر سے بھی فوراً ہی آواز آئی: ''کامیابی ... عمارت میں زبردست ہلچل دیکھنے میں آئی ہے ... وہ عجیب آوازیں بھی سنائی دی ہیں جو ہم پہلے بھی سن چکے ہیں۔''

''اللہ کا شکر ہے ... ہم آرہے ہیں۔''

''ہاں آپ لوگوں کو یہاں فوراً پہنچنا ضروری ہے۔''

'' ہم روانہ ہورہے ہیں۔''

وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہوئے ... انھوں نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ گرنے والی تتلیوں کا کیا حال ہے، گرنے کے بعد وہ کیا یا کیسی نظر آ رہی ہیں۔

آندھی طوفان کی طرح وہ آخر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

'' یہ بتائیں کہ جونہی ہم نے فائر کیے، یہاں کیا دیکھنے میں آیا۔''

'' چند ہلکے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں، کچھ روشنیاں بھی چمکیں اور پھر غائب ہوگئی، تھوڑا سا دھواں بھی ان سوراخوں سے نکلا تھا۔'' انھوں نے بتایا۔

پھر وہ سب عمارت کے دروازے پر آئے۔ محمود نے زور دار انداز میں دستک دی لیکن اندر کسی ہل چل کے آثار نظر نہ آئے۔

'' فاروق جلدی سے اس عمارت کے گرد چکر لگاؤ بلکہ آفتاب آصف تم بھی دوڑ لگا دو اور دیکھو کوئی پائپ ...''

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی انھوں نے دوڑ لگا دی۔

عمارت کی پشت پر پہنچتے ہی انھیں ایک زور دار جھٹکا لگا ...

مارے حیرت کے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ...

☆☆☆☆☆

چھلانگ

عمارت کے پچھلی طرف ایک کھڑکی تھی۔

اس کھڑکی سے ایک بہت لمبی سیڑھی لٹک رہی تھی ... سیڑھی نیچے ایک چٹا ن تک جا رہی تھی ... اس چٹان تک پہنچنا سیڑھی کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نیچے اترتے چلے گئے اور جلد ہی اس چٹان پر جا اترے۔ اس جگہ سے سیڑھی پھر نیچے جاتی نظر آئی ...

اور نیچے سمندر تھا ...

سب نے جھانک کر دیکھا ... ایک بڑی لانچ نیچے کھڑی تھی اور کچھ لوگ سیڑھی کے ذریعے اس لانچ پر اترنے ہی والے تھے۔

" اگر یہ لوگ ہمارے نیچے اترنے سے پہلے اتر گئے تو نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ہم لکیر پیٹتے رہ جائیں گے ... پروفیسر صاحب یہیں ٹھہریں گے ... باقی سب میرے ساتھ آئیں ... آیئے کامران مرزا ..." یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید نے سیڑھی پر پاؤں رکھے اور بلا کی تیزی سے نیچے اترنے لگے۔

ان کے بعد ہی کامران مرزا چلے اور ان کے بعد خان رحمان ... پھر تو ان کی لائن لگ گئی۔

ان سب پر جوش سوار تھا اور وہ سیڑھی پر سوار تھے ...

ادھر سے نیچے والوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ آ رہے ہیں۔

انہوں نے فوراً ہی پستول نکال لیے... لیکن انسپکٹر جمشید پہلے یہ بات سوچ چکے تھے کہ جونہی وہ نیچے والوں کی نظروں میں آئیں گے فائر کریں گے، اس لیے انھوں نے پہلے ہی پستول منہ میں پکڑ رکھا تھا۔

انہیں پستول سیدھی کرتے دیکھ کر انھوں نے سیڑھی پر سے ایک ہاتھ ہٹا کر پستول سنبھال لیا اور ساتھ ہی نیچے فائر کر دیا ...

گولی ٹھیک اس شخص کے پستول پر لگی جو اوپر فائر کرنے کیلئے پر تول چکا تھا ... انہوں نے دیکھا کہ اس کا منہ چیخنے کے انداز میں کھلا تھا۔

فائر کرنے کے بعد وہ پھر تیزی سے نیچے اترنے لگے ...

ایسے میں انھوں نے لانچ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

سیڑھی پر موجود ان لوگوں کا آخری آدمی لانچ پر اتر چکا تھا۔

انسپکٹر جمشید نے سیڑھی کو چھوڑ دیا اور لانچ پر چھلانگ لگا دی ... اور وہ سب کسی طرح بھی اپنی چیخوں کو روک نہ سکے ... ابھی کم از کم چالیس فٹ کی اونچائی باقی تھی ... اندازے کی ذرا سی غلطی انسپکٹر جمشید کا سر پاش پاش کر سکتی تھی ... لیکن وہ چار آدمیوں کے اوپر گرے اور پھر لانچ کے عرشے پر ... فوراً ہی ان پر کئی آدمی ٹوٹ پڑے۔

یہ دیکھتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے بھی چھلانگ لگا دی ...

خان رحمان بھی نہ رہ سکے ... وہ بھی کود گئے۔

جب کامران مرزا کے پاؤں لانچ سے ٹکرائے ... اس وقت تک انسپکٹر جمشید لانچ پر کود پڑنے والوں کو اپنے اوپر سے اچھال چکے تھے۔

وہ ادھر ادھر گرے اور پھر لانچ پر زبردست جنگ شروع ہو گئی۔

باقی لوگ بھی رسّے کے ذریعے جلد از جلد نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اوپر سے چھلانگ نہ لگا پائے لیکن جونہی فاصلہ کم ہوا، انھوں نے باری باری چھلانگیں لگا دیں۔

دس بارہ آدمی انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان سے بھڑے ہوئے تھے ... ایسے میں انسپکٹر جمشید اپنے گرد جمگھٹا کرنے والوں کو ایک جھکائی دی اور ان میں سے ایک کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر پانی میں اچھال دیا ... اس کے گرنے سے زبردست چھپاکے کی آواز آئی۔

یہ دیکھتے ہی کامران مرزا نے کہا:

"لیکن اس طرح ہم انھیں گرفتار نہیں کر سکیں گے۔"

"اوہ!۔"

پھر انہوں نے ہاتھوں اور پیروں کا کھلا استعمال شروع کر دیا۔

ادھر دشمن بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے ...

ایسے میں چھوٹی پارٹی عرشے پر آ گئی ... جنگ کا دائرہ بڑھ گیا۔

"آخر ہم ان کا لحاظ کیوں کر رہے ہیں۔" محمود نے چلّا کر کہا۔

''کیا مطلب ... یہ تم سے کس احمق نے کہہ دیا کہ ہم ان کا لحاظ کر رہے ہیں۔'' آصف نے منہ بنایا۔

''میرا مطلب ہے ... ہمارے پاس چاقو ہیں ... اس کی مدد سے انھیں چند منٹوں میں پار لگایا جا سکتا ہے۔''محمود نے کہا۔

''کامران مرزا کا کہنا ہے کہ انہیں زندہ گرفتار کر کے قوم کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔'' خان رحمان نے لڑتے لڑتے کہا۔

''بات معقول ہے۔''شوکی مسکرایا۔

''لیکن تم لوگوں کے لیے ایک بات نامعقول بھی ہے ... بند کرو یہ دھینگا مشتی۔'' ایک کرخت آواز نے ان کے ہوش اڑا دیے ...

آواز کی طرف دیکھا تو وہاں سے ایک بے ہنگم سا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے اور کے ہاتھ میں ایک آٹو میٹک رائفل تھی۔۔

''ہاتھ اوپر اٹھا دو ... اور میرے ساتھیوں تم لوگ ان سے الگ ہو کر میری طرف آجاؤ تاکہ فائرنگ کی زد میں تم لوگ نہ آجاؤ ... یہ بات انھیں بتاتا چلوں کہ اس گن میں سے ایک بار کے ٹریگر دبانے سے تقریباً سو گولیاں نکلتی ہیں ... اس لیے مجھے نشانہ لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی ... بس تم لوگوں کی طرف رخ کر کے ٹریگر ہی دبانا ہوگا ... چنانچہ تم بے موت مارے گئے ... ہم تو بھاگ رہے تھے لیکن اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی ... تم لوگوں کو بھی اس لانچ پر لے جائیں گے ...

تم لوگوں نے تو ہمارا فیل ہوتا ہوا پلان دوبارہ زندہ کر دیا ... تتلیوں کو مارنے کا طریقہ صرف تمہارے پاس ہے ... اور اب تم قابو آ گئے ہو تو تتلیوں کو مارنے کے طریقے کی لاش بھی تمہاری لاشوں کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں جائے گا ... ویسے تم لوگ بھی کمال ہو بھئی ... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم لوگ اس قدر بے سر وسامانی کے عالم میں بھی تتلیوں کے شکار کا طریقہ دریافت کر لو گے۔''

وہ شوخ آواز میں کہتا چلا گیا۔

'' آپ کی تعریف۔'' انسپکٹر جمشید نے سیدھے ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

'' مجھے پروفیسر صباری کہتے ہیں۔''

'' اوہ ... تو آپ ہیں اس سارے فساد کی جڑ ...'' فاروق اس انداز میں بولا جیسے پروفیسر صباری سے مل کر بہت ہی خوش ہوا ہو ...

اور پروفیسر شنکی چانگ ... اس کا کیا بنا ؟'' آفتاب نے بھنویں اچکائیں ...

'' اسے اوپر باندھ کر چھوڑ آئے ہیں ... اس کا تجربہ بیکار ہونے پر وہ ہمارے لیے کسی کام کا نہیں رہ گیا۔''

'' گویا پروفیسر شنکی چانگ اب اس عمارت میں اکیلا ہے۔''

'' ہاں ہم اسے کرسی سے باندھ آئے ہیں لیکن وہ کرسی جدید قسم کی ہے، اس میں لگے تسمے نہ کھولے جا سکتے ہیں نہ کاٹے۔''

'' تو تتلیاں تباہ ہوتے ہی تم بھاگ کھڑے ہوئے۔''

'' ہاں کیونکہ ہم سمجھ گئے تھے کہ اب کام بگڑ چکا ہے۔''

''لیکن افسوس! ہم تم تک پہنچ گئے۔''

'' پہنچ ضرور گئے لیکن یہی تمہاری غلطی تھی ... تم قابو نہ آتے تو ہمیں خطرہ تھا ... لیکن تم تو خود چل کر آگئے ... اب تمھیں خود کو بندھوانا ہو گا ... انکار کرو گے تو گولیوں کے اس اسپرے کی زد میں آکر اس طرح مارے جاؤ گے جیسے مچھر کے اسپرے کی زد میں آکر مچھر ... میں ثبوت کے طور پر اس گن کا کام تمھیں دکھا دیتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے یکلخت نال کا رخ قدرے اوپر کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی ایک پوری باڑھ ان کے سروں پر سے گزر گئی۔

ان گولیوں کا پھیلاؤ بھی بہت تھا گویا ایک بار کے ٹریگر کے دبانے سے وہ سب کے سب اس کی زد میں آسکتے تھے ...

'' یہ تو واقعی خطرناک ہے۔'' شوکی کانپ کر بولا۔

باقی لوگوں نے اسے تیز نظروں سے گھورا ...

آفتاب تو رہ نہ سکا: ''بزدلی دکھانی کی ضرورت نہیں۔''

'' ہاں لیکن ان حالات میں اور کیا دکھاؤں۔''

'' بہادری ...'' آفتاب غرایا۔

''بہادری دکھانے کے لیے تم جو ہو۔''

'' اپنی باتوں سے تم مجھے الجھا نہیں سکتے ... تمھارے پاس دو

راستے ہیں، ان میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔'' پروفیسر صباری بولا۔

''دو راستے ... یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔'' فاروق چونکا۔

''ایک راستہ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بندھوا لو ... دوسرا راستہ یہ ہے کہ میری گن کی گولیاں اپنے جسم میں اتار لو ... مجھے تو بس ٹریگر دبانا ہے اور بس۔'' وہ بے رحمی سے ہنسا۔

''ہمیں سوچنے دو پروفیسر صباری۔''

''سوچنے کی کیا بات ہے، آر یا پار والی بات کرو انسپکٹر صاحبان ... بہت نام ہے تمھارا ... آج کوئی کاریگری کیوں نہیں دکھائی۔''

'' اوکے ...ہم خود کو بندھوا لیتے ہیں۔''

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا ... چلو میرے ساتھیو انھیں باندھ لو۔''

پروفیسر صباری کے ماتحت فوراً ایک طرف بڑھ گئے ...

وہاں عرشے پر رسیوں کا ڈھیر موجود تھا۔ وہ اٹھا کر ان کی طرف بڑھے ... ادھر پروفیسر صباری کی نظریں ان سب کی طرف تھیں اور وہ پوری طرح چوکس تھا ... ایسے میں اس کے کندھے پر ایک پتھر آ کر لگا۔

انہوں نے دیکھا ... پتھر پروفیسر داؤد نے پھینکا تھا ...

وہ ان کی مہارت پر حیران رہ گئے ... اتنی اونچائی سے پتھر اس طرح پھینکنا کہ وہ ٹھیک نشانے پر لگے، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پتھر لگنے پر وہ بری طرح لڑکھڑا گیا ... انسپکٹر جمشید کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا ...انھوں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کا گن والا

ہاتھ پکڑتے ہوئے اس سمت عرشے کے کنارے پر جا لگے۔

لیکن پروفیسر صباری گن چھوڑنے پر کسی طرح بھی تیار نہیں تھا۔

انہوں نے زور لگایا اور جب گن اس کے ہاتھ سے نہ نکلی تو دائیں ہاتھ کا مکّا اس کی کن پٹی پر دے مارا اور بس اسی لمحے گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید محسوس کر چکے تھے کہ اس میں بے پناہ طاقت ہے۔

یہ بات نہ ہوتی تو پہلے ہی جھٹکے میں وہ گن اس کے ہاتھ سے چھین چکے ہوتے۔ اس بات پر انھیں حیرت ہوئی لیکن یہ موقع حیران ہونے کا کہاں تھا۔

ادھر گن اس کے ہاتھ سے نکلی ادھر انسپکٹر جمشید نے گن کی طرف چھلانگ لگا دی ، ساتھ ہی پروفیسر صباری نے چھلانگ لگائی۔

دونوں ایک دوسرے پر گرے اور گن ان کے نیچے دب گئی۔

انسپکٹر جمشید نے زور لگا کر اسے اپنے اوپر سے اچھال پھینکنے کا گر استعمال کیا ... یہ وہ حربہ تھا جو جیرال اور سی مون جیسوں پر استعمال کر چکے تھے لیکن ... وہ پروفیسر صباری کو اچھال نہ سکے۔

پروفیسر صباری نے بھی یہ بات محسوس کر لی ... وہ ہنسا:

’’ انسپکٹر جمشید ... پروفیسر صباری ایک بکرا روز کھاتا ہے ... تم اسے ہاتھوں اور پیروں سے شکست نہیں دے سکتے ۔‘‘

’’ تو پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ ، گن کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔‘‘

'' تم کہو تو سمندر میں پھینک دوں ...'' وہ پرغرور انداز میں بولا۔

'' لیکن ایک قیمتی چیز سمندر میں کیوں گرائیں ، جو مقابلہ جیت گیا گن اس کی ۔''

'' مجھے منظور نہیں۔'' پروفیسر وحشیانہ انداز میں مسکرایا ...

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا :

'' عرشے کے کنارے پر چلے جاؤ ... انسپکٹر جمشید کو مجھ سے مقابلے کی سوجھی ہے ، دوسرے الفاظ میں اپنا سر دو ٹکڑے کرانے کی سوجھی ہے ... میں اسے بتا دوں گا کہ میں کسی بھی انسان کے سر پر ہاتھ کی ہڈی مار کر اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں ۔''

'' اب آپ نے بتا تو دیا ہے سر۔'' ایک ماتحت نے ہنس کر کہا ۔

اب دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے ... گن جوں کی توں پڑی رہی۔ دونوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ...

'' گن کا کیا کریں سر ... اس کے ایک ماتحت نے پوچھا۔

'' اٹھا کر سمندر میں پھینک دو ... اب اس کی ضرورت نہیں ۔''

'' لیکن یہ لوگ تو اپنے پستول نکال سکتے ہیں ۔''

'' کیوں انسپکٹر ... موقع محل دیکھ کر پستول نکال لو گے کیا ۔''

'' نہیں ... اب مقابلہ ہاتھوں اور پیروں سے ہی ہوگا ۔''

'' اور میرا دعویٰ ہے تم سب مل کر بھی مجھ پر قابو نہیں پاسکو گے ... لو تجربہ کر لو کہ کس سے مقابلہ کرنے چلے ہو، تم نے گینڈا دیکھا ہے ؟''

''ہاں بہت دفعہ۔''

''پتا ہے گینڈے میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میں ایک گینڈے جتنی طاقت ہے۔''

''نہیں ... بلکہ مجھ میں دو گینڈے جتنی طاقت ہے۔''

''اب تمھارا غرور ہم اور طرح خاک میں ملائیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''ہمارا سب سے کمزور دبلا پتلا ساتھی تم سے مقابلہ کرے گا۔''

''ارے کیوں کسی بچے کو میرے ہاتھوں مروانا چاہتے ہو۔''

''غرور کا سر نیچا کرنا ضروری ہے۔''

''ارے میں تو بھول ہی گیا ... وہ اوپر سے پتھر کس نے مارا تھا۔''

''بہت دیر بعد یاد آیا ... اور ہمارے ایک ساتھی اوپر موجود ہیں اور ان کا نام پروفیسر داؤد ہے ... ظاہر ہے یہ کام انھوں نے کیا ہے ... وہ اوپر دیکھو، کھڑے ہاتھ ہلا رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔''

بہت جلد ان کی مسکراہٹ بجھنے والی ہے۔''

''اخلاق احمد آگے آ جاؤ ... اس شخص کا غرور تم توڑو گے۔''

''مم ... مم ... مم ... میں۔'' اخلاق بری طرح ہکلایا۔

''رہنے دیں ابا جان۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''نہیں ... اخلاق ہی مقابلہ کرے گا۔''

''ان ... ان ... کل ...''

'' ہم ان ... انکل نہیں کہتے ، انکل کہتے ہیں۔'' آفتاب بھنا اٹھا۔

'' سس ... سسوری۔''

'' سوری کو سسوری بنا دیا ... ہمت ہوتی نہیں اور آ جاتے ہیں ... وہیں اپنے شہر میں چھوٹے موٹے کیس کیا کرو۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

'' ٹھٹھ ... ''

'' ٹھٹھ ... کیا۔''

'' کک ... کک ... کچھ نہیں۔'' اخلاق اور زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے بدن میں کپکپی تھی۔

'' جانے دو انسپکٹر ، یہ تو میرے ایک ہلکے سے تھپڑ کی بھی مار نہیں۔''

'' اس میں شک نہیں لیکن۔''

'' اور لیکن کیا ؟''

'' لیکن ... نہیں میں کچھ نہیں کہوں گا ... مقابلہ اخلاق ہی کرے گا ... چلو اخلاق اب ڈرنے کے ریکارڈ توڑنے بند کرو اور آگے بڑھو ... مردِ میدان بنو۔''

''یہ ... مردِ میدان کیا ہوتا ہے انکل۔'' اخلاق نے کانپ کر کہا۔

'' ہا ہا ہا۔'' پروفیسر صباری ہنسا۔ اتنے میں اخلاق آگے آگیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا ... چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ...

'' اب بھی وقت ہے ... اس بیچارے کی جگہ کسی اور کو بھیج دو۔''

'' نہیں !'' انسپکٹر جمشید سخت لہجے میں بولے۔

''مقابلہ شروع کرو پروفیسر صباری۔'' خان رحمان نے منہ بنایا۔
'' تم لوگوں کی مرضی ... میں بس اسے ایک ہاتھ لگاؤں گا ... ہلکا سا ہاتھ ... وہ بھی بہت پیار بھرے انداز میں۔''
یہ کہہ کر پروفیسر صباری اخلاق کی طرف بڑھا۔
اخلاق کے اب دانت بجنے لگے تھے ... نزدیک آتے ہی پروفیسر نے اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔
اخلاق فوراً ہی نیچے بیٹھ گیا اور اسی حالت میں اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر اپنے سر کی ٹکر اس کی ریڑھ کے نچلے حصّے پر ماری ... پروفیسر صباری اچھل کر اوندھے منہ گرا ...
سب یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے ... ان میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے ...
'' مم ... معافی چاہتا ہوں۔''
'' معافی کس بات کی اور کس سے۔'' پروفیسر صباری نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔ اب وہ اخلاق کو عجیب انداز میں گھور رہا تھا۔
'' آپ سے ... اس بات کی معافی کہ مجھ سے یہ کیا حرکت سرزد ہوگئی ... اب ایسا نہیں ہوگا آپ بے فکر ہو کر وار کریں۔''
'' حد ہوگئی، بھائی تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' آصف جھلاّ اٹھا۔
'' نن نہیں تو ... کیا تم نے اسے چلتے دیکھا ہے۔'' اخلاق نے حیران ہو کر کہا۔

''کسے؟'' آصف چلّایا۔

''میرے دماغ کو، اور کسے۔''

''او بھائی ... ہوش کر ... مقابلہ سخت ہے۔''

''اوہ ... نن ... نہیں۔'' اس نے خوف کے عالم میں کہا۔

کیونکہ عین اس وقت اس نے پروفیسر صباری کو بلا کی تیزی سے خود پر حملہ کرتے دیکھا تھا ... وہ مارے خوف کے منہ چھپا کر ایک طرف ہو گیا۔ اس کے ایک طرف ہونے کے انداز کو دیکھ کر سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ پروفیسر صباری اپنی جھونک میں آگے نکل گیا تھا۔

وہ ابھی رک نہیں پایا تھا کہ اخلاق نے پوری طاقت سے اپنے سر کی ٹکر اس کی کمر پر دے ماری ... پروفیسر اچھلا اور سمندر میں جا گرا۔

وہ اپنی جھونک میں وہ عرشے کے عین کنارے پر تھا۔

''ارے یہ کیا ... اخلاق زندہ باد۔''

وہ سب پرجوش انداز میں چلّانے لگے۔

ادھر پروفیسر صباری پہلے پانی میں نیچے گیا ... پھر اوپر آیا ... ساتھ ہی اس نے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے ...

یہاں تک کہ تیر کر وہ لانچ تک آ گیا ...

''کیا ہم اسے اوپر آنے سے روک دیں۔'' محمود نے اجازت طلب انداز میں کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' اخلاق نے فوراً کہا۔

''لڑنے دو بھئی ... انھی کو لڑنے دو۔''

اتنے میں پروفیسر صبّاری غرّایا: ''نہیں چھوڑوں گا۔''

''اچھا بھائی ... نہ چھوڑنا۔'' آفتاب نے منہ بنایا۔

وہ ایک بار پھر اخلاق کی طرف بڑھا۔ اس وقت انسپکٹر کامران مرزا نے کہا: ''اخلاق ... ہوشیار اس کے تیور خطرناک ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے ... پہلے اس کے تیور خطرناک نہیں تھے۔''

''ہاں ...نہیں تھے۔''

عین اسی لمحے پروفیسر صبّاری گن کے نزدیک پہنچ گیا ... وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا ... اسی وقت ایک پتھر اوپر سے آیا اور اس کے سر پر لگا ... اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

''یہ دوسرا پتھر بھی تمھیں ہمارے پروفیسر انکل کی طرف سے تحفہ ہے۔'' فاروق نے ہنس کر کہا۔

انھوں نے دیکھا ... پروفیسر صبّاری کا سر پھٹ گیا تھا۔

ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا گن اٹھا چکے تھے اور اس کا رخ اس کے ساتھیوں کی طرف کر چکے تھے۔

ان سب کی آنکھوں میں وہ خوف ہی خوف دیکھ رہے تھے ...

''ہاتھ اوپر اٹھا دو ... تمھارے پروفیسر صبّاری تو اب پہلے مرہم پٹی کرائیں گے پھر کہیں جا کر وہ لڑنے کے قابل ہو سکیں گے لہٰذا اس وقت تک کے لیے تم اپنے آپ کو بندھوا لو ... چلو بھئی جو رسیاں یہ تم

لوگوں کے لیے اٹھا کر لائے تھے ، اب ان سے انھی کو باندھ دو۔"

"ج ... جی اچھا ... یار اخلاق معاف کرنا ، تم نے تو آج کمال کر دیا ... ہمیں لڑنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"م ... معافی چاہتا ہوں۔" اخلاق بولا۔

"لیکن کس بات کی ..."

"موقع نہ دینے کی ..."

"دھت تیرے کی ..."

ان سب کو باندھ کر وہ اوپر پہنچے ...

اور کھڑکی کے ذریعے عمارت کے اندر داخل ہوئے۔

اس وقت مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئیں ...

☆☆☆☆☆

گینڈا

اس وقت وہ اس عمارت کے ایک ہال نما کمرے میں تھے۔
اس کمرے کی دیواروں میں چاروں طرف سوراخ تھے۔
ان سوراخوں کے پار ایسے آلات نصب تھے جن میں کوئی چیز رکھ کر دور پھینکی جا سکے ... ان آلات کی نلکیوں میں وہ تتلیاں قطاروں میں رکھی نظر آئیں۔ کمرے کے ایک طرف ایک بڑی کرسی نظر آئی۔
اس کرسی کے ساتھ بہت بڑی اور مستطیل میز تھی اور اس میز پر آلات نصب تھے۔ ان آلات میں بے شمار بٹن تھے۔
پہلی کرسی کے ساتھ ایک اور کرسی تھی اور اس کرسی پر پروفیسر شنگی چانک بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں اور پیر کو عجیب قسم کے تسموں نے جکڑا ہوا تھا گویا اسے کرسی سے جکڑ دیا گیا تھا۔
وہ بس اپنے سر کو حرکت دے سکتا تھا اور اس وقت بے ہوش تھا۔
پروفیسر داؤد نے تتلیوں کا مرکزی کنٹرول سسٹم سنبھال لیا ...اسے سمجھنے میں انہیں تین گھنٹے لگے اور پھر پورا سسٹم ایک دم بند ہو گیا۔
اس کے معنی یہ تھے کہ تتلیاں جہاں جہاں بھی محو پرواز تھیں ، وہ

وہیں زمین بوس ہو گئیں ... انہوں نے کنٹرول روم کے لاتعداد اسکرینوں پر تتلیوں سے منسلک کیمروں کی مدد سے ان کے گرنے کے مناظر دیکھے۔

یہ ایسے ہی مناظر تھے جیسے کوئی ہیلی کاپٹر نیچے آتے آتے زمین سے ٹکرا جائے ... جیسی ہی تتلی گرنا شروع ہوتی، پہلے تو اس کے کیمرے کا رخ زمین کی طرف پڑ جاتا اور پھر تتلی کے زمین سے ٹکرانے کا پتا اس وقت چلتا جب کسی سڑک، عمارت اور درخت سے گرنے کے بعد کیمرہ ایک ہی منظر پر ساکت ہو جاتا۔

عمارت کی دو منزلیں کنٹرول روم پر مشتمل تھیں جہاں سے ہزاروں تتلیوں کو بیک وقت چلایا جا رہا تھا ...

پروفیسر داؤد اس نظام کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے ...

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے مشورے کے مطابق انہوں نے سسٹم کو تباہ نہیں کیا تھا، بلکہ فیصلہ کیا تھا کہ تتلیوں کا یہ سسٹم ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے آرمی کے حوالے کر دیا جائے ...

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"اس سے پہلے کہ ہم پروفیسر شنکی چانگ کو ہوش میں لائیں ... میں پہلے صدر صاحب کو فون کر لوں تا کہ ملک میں حالات اصل لوگوں کے ہاتھ میں آ جائیں۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے ان کی تائید کی۔

اب انہوں نے صدر صاحب کو وائرلیس کیا:

فوراً ہی ان کی آواز کمرے میں گونجی : '' کیا رہا جمشید ۔''
آواز سے حد درجے بے چینی جھلک رہی تھی ۔

'' اللہ کا کرم ہو گیا ... ہم کامیاب ہو گئے ...آپ فوراً ملک میں واپس آ جائیں ۔''

'' لیکن کیسے ... ایر پورٹ تو بند ہیں ، اور ملک کا صدر اس وقت بھی سرفرازی ہے ۔''

'' آپ سلطان سے اسپیشل طیارے کا بندوبست کروا لیں اور میں یہاں انتظام کرتا ہوں ... میڈیا کو بھی اطلاعات دے دیتا ہوں کہ تلیوں کو ختم کر دیا گیا ہے ، صدر صاحب واپس ملک میں آ رہے ہیں۔ جونہی یہ خبریں شروع ہوں گی ... سرفرازی خود غائب ہو جائے گا۔''

'' لیکن جمشید اس کا غائب ہو جانا تو اچھا نہیں ہوگا ، اسے تو گرفتار کرنا چاہیے ۔''

'' ان اعلانات سے پہلے میری خفیہ فورس سرفرازی کو قابو کرنے کے لیے پہنچ جائے گی ... ایوانِ صدر سے فرار ہونے سے پہلے ہی میرے آدمی اسے قابو کر لیں گے ، آپ کا طیارہ اترے گا تو یہاں حالات بدل چکے ہوں گے ۔''

'' تم لوگوں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جمشید کہ میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔''

'' آپ فکر نہ کریں ... انکل صدر ہم دے دیں گے ۔''

''کیا دے دیں گے۔'' صدر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تعریف کے لیے الفاظ۔''

''اوہ اچھا۔''صدر صاحب نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔

اب پہلے خفیہ فورس سے رابطہ کیا گیا... انہیں ہدایات دیں۔

پھر آئی جی صاحب کو دشمنوں کے ہیڈ کوارٹر سے فون کیا...

ان کا موبائل بند نہیں کیا گیا تھا... اس لیے رابطہ ہو گیا...

وہ تو ان کی آواز سن کر پھڑک ہی اٹھے:

''کہاں ہو جمشید... پوری قوم تمھیں یاد کر رہی ہے۔''

''ان کا خاتمہ ہو چکا ہے سر... پورے ملک کی فضا پر اس وقت ایک تتلی بھی نہیں ہے۔''

''کیا... یہ... یہ کیسے ہو گیا۔''

''آپ پہلے چند ضروری کام انجام دے لیں... پھر سب کے ساتھ ہی آپ بھی سن لیں گے کہ کہ کیسے ہوا۔''

''بتاؤ کیا کرنا ہے۔''

''ہیں تو آپ اپنے عہدے پر ہی؟''

''نہیں جمشید... انھوں نے بالکل غیر اہم جگہ پر لگا دیا تھا... مجھے ہی نہیں... تم سے متعلق سب لوگوں کو۔''

''ٹی وی چینلوں پر میں اعلانات کروا رہا ہوں کہ تتلی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے، صدر صاحب واپس آ رہے ہیں، لہٰذا ان کے استقبال

کے لیے تیار ہو جائیں۔''

'' آپ سینیٹ کے چیرمین صاحب کو خبر کر دیں کہ تتلی حکومت ختم کر دی گئی ہے اور آئین بحال کیا جا سکتا ہے ... اس طرح صدر صاحب کے ملک سے باہر ہونے کی صورت میں ان کی واپسی تک وہ خود بخود آئینی طور پر صدر بن جائیں گے ... ان حالات میں آرمی چیف اور پولیس ان کے احکام ماننے کی پابند ہو جائیں گے ... اس طرح تمام باغیوں کو گرفتار کیا جا سکے گا اور ان کی حکومت باقاعدہ طور پر ختم ہو جائے گی ...''

'' یہ کام ہو جائے گا جمشید ... بس ابھی لو۔''

'' سرفرازی کی گرفتاری کے لیے میں نے اپنی فورس کو مقرر کر دیا ہے سر ... وہ اسے پکڑ کر سیدھے ہمارے پاس لے آئیں گے۔''

'' اور تم کہاں ہو جمشید۔''

'' ہم اس وقت دشمن کے ہیڈ کوارٹر میں ہیں یعنی جہاں سے تتلیاں اڑائی جاتی تھیں ... اس مقام کے بارے میں آپ کو بتا دوں گا ، پہلے ضروری کام کر لیں۔''

'' جی خوش کر دیا جمشید ، ملک کو تم جیسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے ...تم لوگوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔''

'' آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں سر ...''

انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا اور فون بند کر دیا۔

''کیا اب ہم پروفیسر شنکی چانگ کو ہوش میں لانے کی کوشش نہ کریں۔''

''ابھی مناسب نہیں ... اب جو ہوگا، سب کے سامنے ہوگا۔''

''جی اچھا۔''

اور پھر انھیں ایر پورٹ سے فون آ گیا ...

صدر صاحب ایر پورٹ پر اتر گئے تھے ... انھوں نے فوراً کہا۔

'' آئی جی صاحب ایرپورٹ پر موجود ہیں ... صدر مملکت ان کی گاڑی میں آئیں گے ... میں انھیں بتا رہا ہوں کہ کہاں آنا ہے۔''

کچھ دیر بعد وہاں صدر صاحب پہنچ گئے۔

ان کے ساتھ اور بھی کئی بڑے بڑے آفیسرز آ گئے۔

جلد ہی بعد خفیہ فورس وجاہت میر سرفرازی کو بھی لے آئی۔

اس کا رنگ بالکل زرد اور آنکھوں میں زمانے بھر کی ویرانی تھی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تتلیوں کا تختہ اس طرح الٹ سکتا ہے ... اب وہاں تمام متعلقہ لوگ آ چکے تھے ...

اس وقت انسپکٹر جمشید نے کہا: ''پہلے میں آپ کو تمام حالات سناؤں گا، پھر ہم پروفیسر شنکی چانگ کو ہوش میں لائیں گے۔''

'' لیکن پہلے پروفیسر کو ہوش میں کیوں نہ لایا جائے جمشید ... ہو سکتا ہے کہ ان کو طبی امداد کی ضرورت ہو۔'' خان رحمان نے کہا۔

'' اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔'' انہوں نے کہا ... صدر مملکت کے

ساتھ میڈیکل ٹیم بھی آئی تھی ... اسے ہوش میں لانے کیلئے ان کی خدمات حاصل کی گئیں ... انہوں نے پہلے اس کا معائنہ کیا ، پھر ایک انجکشن دیا ... ایک منٹ کے بعد ہی پروفیسر شنکی چانگ نے آنکھیں کھول دیں ... پہلے خالی خالی نظروں سے ٹکر ٹکر انہیں دیکھتا رہا ... پھر اچانک جیسے اس کو سب کچھ یاد آ گیا ... اور اس کے منہ سے نکلا :

"ارے یہ کیا ... وہ کہاں ہے غدار پروفیسر صباری ۔"

"یہیں ہے پروفیسر ... ہماری قید میں ... بازی الٹ چکی ہے۔"

"اوہ تب تو ٹھیک ہے ... ان لوگوں نے مجھے کرسی کا قیدی بنا دیا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ اب اسی کرسی پر میری موت آئے گی۔"

"اب اس کرسی سے آپ کو نجات مل گئی ..."

"آپ لوگ بہت زبردست لوگ ہیں ۔" پروفیسر شنکی چانگ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا اب میں رپورٹ پیش کر دوں سر ۔" انھوں نے صدر کی طرف دیکھا ۔

"ہاں جمشید بالکل ، لیکن پہلے پروفیسر شنکی چانگ کو کرسی سے تو نجات دلا دیں۔"

"پروفیسر چانگ ... کیا اس کرسی کے تسمے کھولنے کا طریقہ آپ کو معلوم ہے۔"

"ہاں انسپکٹر ... سامنے جو سوئچ بورڈ لگا ہوا ہے ... بس اس کا نیلا

بٹن دبا دیں۔''

'' محمود نے نیلا بٹن دبا دو۔''

نیلا بٹن دبتے ہی تسمے کھل گئے۔

پروفیسر شنکی نے اٹھنا چاہا لیکن اٹھا نہ گیا...

'' اٹھنے کی طاقت نہیں ... فی الحال مجھے یہیں بیٹھے رہنے دیں۔''

'' کیا ہم آپ کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیں۔''

'' نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

'' اچھی بات ہے ... حاضرین ... ہمارے سامنے یہ معاملہ اس وقت آیا جب پروفیسر شنگی چانگ کی سائنسی ٹیم کے پانچ اسسٹنٹوں نے ان کی ایجاد پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر وہ عملی طور پر انھیں قابو میں کرنے پر اتر آئے لیکن پروفیسر صاحب نے خود انھیں قابو میں کر لیا اور ہمیں فون کر دیا۔ پروفیسر نے ایک ایسی ڈرون نما تتلی ایجاد کی تھی جو ہمارے دشمن ملکوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی ... عام ڈرون کے مقابلے میں یہ تتلی کہیں زیادہ تباہ کن اور سستی ہے ... لیکن شاید ان کے ماتحت دشمن ملکوں کے ایجنٹوں کے ہاتھ اس ایجاد کو فروخت کرنا چاہتے ہیں ... انھوں نے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا ... ماتحت پکڑے گئے ... لیکن معلوم ہوا کہ تتلیاں غائب تھیں اور ساتھ ہی پروفیسر صباری بھی، جو پروفیسر چانگ کی تتلیوں کے راز سے واقف تھا ... اب اس کے دو مطلب نکلتے تھے ... پروفیسر صباری تتلیاں لے اڑا ... یا پھر اسے بھی تتلیاں

چرانے والوں نے اغوا کرلیا ... پروفیسر صباری کی تلاش کے دوران علم ہوا کہ اس نے پروفیسر چانگ کو اپنا رہائشی پتا غلط لکھوایا تھا ... اس سے پروفیسر صباری کے ملوث ہونے کا شک درست نکلا ... ہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ جب پروفیسر شنکی نے تتلیوں والا خانہ خالی دیکھا تو یہ بیہوش ہو گئے تھے ... انہیں ہوش میں لایا گیا تو انھوں نے پروفیسر صباری کے بارے میں بتایا تھا ... اس کے بعد پروفیسر شنکی چانگ بھی لاپتہ ہو گئے اور ہمارا شک انہی لوگوں پر گیا جو اس سے پہلے تتلیوں کو بھی غائب کر چکے تھے ... ان کی تجربہ گاہ کے اس کمرے میں ایسے آثار ظاہر تھے کہ پروفیسر شنکی چانگ کو اغوا کر لیا گیا ہے ... ہم نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا تو کمرے کے فرش پر تازہ خون کا ایک دھبہ نظر آیا، اور ایک سوئی بھی۔ اس سوئی کی نوک پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ اس خون آلود سوئی پر ہم نے بہت غور کیا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ... پروفیسر شنکی چانگ، کیا آپ کچھ بتا سکتے ہیں اس سوئی کے بارے میں۔''

''جب میں ان کے قابو میں کسی طرح نہ آیا تو انھوں نے یہ سوئی میری کلائی میں چبھو دی تھی اور میں فوراً بے ہوش ہو گیا تھا ... بس اس کے بعد مجھے اس کرسی پر ہوش آیا تھا اور اس کے تسمے بندھے ہوئے تھے ... اس کے بعد انہوں نے مجھ سے تتلی کو کام میں لانے کا طریقہ سیکھا، اسے آپریٹ کرنا سیکھا، اسے آپریٹ کرنا بہت ہی آسان تھا، بس سمت میں جگہ مقرر کرنا پڑتی تھی ... پروفیسر صباری یوں بھی اس سارے کام

میں میرا معاون رہا تھا ، اس لیے وہ بہت کچھ پہلے ہی جانتا تھا ... اس طرح ان لوگوں نے بہت جلد ٹاور کو نشانہ بنانے کا پروگرام ترتیب دے لیا اور بس ... اس کے بعد کے واقعات تو آپ ہی سنائیں گے۔"

"ہاں بالکل !" یہ کہتے ہوئے وہ باقی لوگوں کی طرف گھوم گئے ۔

" آپ لوگ جانتے ہیں ... پھر یہاں کیا حالات پیش آئے ... ہمیں اور صدر مملکت کو فوراً ملک چھوڑنا پڑا ... ہم دوست ملک پہنچے ... اور وہاں تتلیوں کو تباہ کرنے کیلئے دھاتوں پر تجربات کرتے رہے ... اور آخر کار ہمارے ساتھی اور ہمارے ملک کے سائنسدان پروفیسر داؤد ایسے کارتوس بنانے میں کامیاب ہو گئے جن سے تتلیوں کو تباہ کیا جا سکتا تھا ... پہلے جب ہم نے تتلیوں پر فائر کیا تھا تو ہماری گولیاں پگھل کر نیچے آ گری تھیں ، اس سے ہم نے سوچا کہ ایسی گولیاں بنائی جائیں جو پگھل نہ سکیں اور سیدھی تتلیوں کو جا لگیں ... ہم نے وہاں رہتے ہوئے یہ تجربہ مکمل کر لیا اور بے شمار گولیاں بنا ڈالیں لیکن وہ ہمارے کام اس وقت آتیں جب ہم اپنے ملک واپس آنے کے قابل ہوتے ... ہمارے وہاں سے نکلنے اور اپنے ملک واپس آنے کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں ... لیکن راستہ ہم نے تلاش کر لیا ، راستہ خطرناک تھا ، میں آپ لوگوں کو راستے کی مشکلات کے بارے میں بھی بتاتا ہوں ۔"

انہوں نے جنگل کے سفر اور اس میں پیش آنے والے حالات بھی تفصیل سے سنا ڈالے ... اس کے بعد انہوں نے کہا :

''واپس آنے کے بعد ہم نے غور شروع کیا کہ ان لوگوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر کہاں بنایا ہو گا ، ہم نے نقشے پر تین جگہوں پر نشانات لگائے اور ان کو چیک کرنے کا کام شروع کیا ... پہلے ایک علاقے کو دیکھا ... وہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا لیکن وہاں ہیڈ کوارٹر کی قسم کی کوئی عمارت نظر نہ آئی۔ پھر دوسری جگہ کو چیک کیا ، وہاں بھی کچھ نہیں تھا ۔ اس دوران ہمارے میزبان سے کوئی شخص بکریاں خریدنے آگیا، وہ دو ماہ سے آتا رہا تھا اور ہر ہفتے چھ سات بکریاں خرید کر لے جاتا تھا ... ہمیں حیرت ہوئی ... ہم نے اس کا تعاقب کیا تو وہ ہمارے سوچے ہوئے تیسرے مقام پر پہنچا تھا ... اس جگہ یہ عمارت ہمیں نظر آئی اور یہ اسی مقام پر تھی جسے ہم نے نقشے پر ہیڈ کوارٹر کے تیسرے ممکنہ مقام کے طور پر مارک کر رکھا تھا ... عمارت پراسرار تھی ... پھر اب جب ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ یہی جگہ ہیڈ کوارٹر ہے ... تو ہم نے تتلیوں پر فائر کرنے کا پروگرام بنایا ... یہ ایک انتہائی خطرناک تجربہ تھا ... جس کی ناکامی ہمیں کہیں کا نہ چھوڑتی ... اور ہماری نہ صرف یہ کہ ساری محنت اکارت ہو جاتی بلکہ ہم ایک بار پھر گرفتار کر لیے جاتے اور ظاہر ہے کہ اس بار دشمن ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے ... ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے ، ایک پارٹی کو وہاں پہنچنا تھا جہاں تتلیاں موجود ہوں اور وہاں پہنچ کر ان پر فائرنگ کرنا تھی ... دوسری طرف عین فائرنگ کے وقت اس عمارت میں ہونے والی تبدیلی کا جائزہ لینا تھا ۔''

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید سانس لینے لگے ...

اسی لمحے صدر مملکت بول اٹھے۔ ''بہت خوب بھئی بہت خوب۔''

'' شکریہ سر... پھر ہم نے تتلیوں کو نشانہ بنایا اور الحمد للہ ہمارا تجربہ کامیاب رہا... تتلیاں نیچے آگریں ... ادھر عمارت میں ہلچل کے آثار نظر آئے ... یہ بات انسپکٹر کامران مرزا نے مجھے بتائی ... ہم فوراً یہاں پہنچ گئے ... یہاں کچھ لوگ پہاڑوں سے اتر کر سمندر کے راستے لانچ میں فرار ہونے کے قریب تھے گویا فرار ہونے کی تیاریاں مکمل تھیں ... بس وہاں پروفیسر صبّاری اپنے پندرہ سولہ لوگوں کے ساتھ موجود تھا ... ان سے ہمیں باقاعدہ جنگ لڑنا پڑی ... کیا میں یہ قصہ مختصر کر کے آگے بڑھ جاؤں سر۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے صدر مملکت کی طرف دیکھا۔

'' نہیں جمشید ... جنگ کی تفصیل بھی ہمارے لیے بہت دلچسپی کی چیز ہو گی۔'' صدر مسکرائے۔

انہوں نے لانچ پر ہونے والے مقابلے کی تفصیلات شروع کیں۔ سب لوگ نہایت دلچسپی سے سن رہے تھے ... اس دوران انھوں نے پروفیسر داؤد کے کارنامے اور اخلاق احمد کے جنگ کے طریقے کے بارے میں بھی بتایا تو صدر مملکت قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکے۔۔

باقی لوگ بھی مسکرا رہے تھے ... ادھر انسپکٹر جمشید کہہ رہے تھے :

'' اس طرح آخر کار آپ سب لوگ یہاں موجود ہیں ... تتلیوں کو قابو کیا جا چکا ہے، ملکی حالات پوری طرح قابو میں ہیں ...''

''گویا یہ سارا منصوبہ پروفیسر صبّاری کا تھا ورنہ پروفیسر شنکی چانگ نے تو یہ تتلیاں ہمارے ملک کے لیے بنائی تھیں ... اور ہمارا ملک واقعی ان تتلیوں کے ذریعے دشمن ملکوں پر اپنی ڈھاک بٹھا سکتا تھا لیکن افسوس پروفیسر صبّاری کی غداری نے یہ دن دکھایا۔''صدر مملکت بولے۔

''مطلب یہ کہ پروفیسر صبّاری نے شروع سے ہی ذہن بنا لیا تھا۔'' آئی جی صاحب بول اٹھے۔

''پروفیسر صبّاری نے نہیں سر ...'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''تو پھر کس نے ...'' صدر مملکت چونکے۔

''پروفیسر شنکی چانگ نے۔'' انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب ... کیا کہا آپ نے۔''

کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں ...

☆☆☆☆☆

آخری بات

سب کے چہروں پر حیرت ہی حیرت نظر آئی۔
سب سے زیادہ حیرت پروفیسر شنکی کے چہرے پر تھی۔
خان رحمان سے رہا نہ گیا ... وہ پکار اٹھے...
"یہ کیسے ہو سکتا ہے جمشید ... کامران مرزا ..."
"یہ سارا منصوبہ پروفیسر شنکی چانگ کا تھا اور شروع سے ہی اسی کا تھا بلکہ اس شخص کو ہمارے ملک میں بھیجا ہی اسی لیے گیا تھا یعنی پورے ملک پر قبضہ کرنے کیلئے ... تعلق تو اس کا شائنا سے تھا ... چونکہ شنکی چانگ کو ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہا کہ کہیں ہمارے ملک کے جاسوس ادارے اس پر نظر نہ رکھے ہوئے ہوں، لیکن ایک مجبوری کے تحت اپنی حفاظت کیلئے اسے ہمیں بھی اپنے پلان کا حصہ بنانا پڑا ... یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ وہ پانچ ملازمین اس کی سازش کا حصہ نہیں تھے ...وہ تو دراصل اتفاق سے کود پڑے ... پروفیسر شنکی چانگ کی بدقسمتی کہ تجربہ گاہ کے ملازمین کی نیت خراب ہو گئی ... وہ بھی تتلیوں پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ بیٹھے ... اس طرح ہم لوگ وہاں جا پہنچے ... اس طرح

تتلیوں کا معاملہ چونکہ ہمارے علم میں آیا ... پھر اس نے سوچا ہو گا ہمیں بلانے کی صورت میں اس کو دوہرا فائدہ ہو گا ... ایک تو اسے اپنے چور ملازمین سے چھٹکارا مل جائے گا اور دوسرا یہ کہ اس طرح کیونکہ اس طرح ہم اس کے حق میں گواہی دیتے کہ پروفیسر شنکی چانگ کا اس سازش میں ہاتھ نہیں تھا ...میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اگر ملازمین کو گرفتار کروانے کیلئے اسے ہم کو بلانا نہیں پڑتا تو پھر بھی یہ پولیس سے مدد ضرور لیتا ... عین ممکن تھا کہ اس صورت میں ہمیں تتلیوں کے غائب کیے جانے سے پہلے کسی نہ کسی بہانے وہاں بلایا جاتا ... ہمیں یا محکمہ سراغرسانی کے کسی اور انسپکٹر کو ... تاکہ چوری کے ڈرامے کو سند دلوائی جا سکے۔ رہا سوال کہ یہ کام وہ کسی اور ملک میں رہ کر بھی کر سکتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اسے ہمارے ملک کے وزیروں اور مشیروں کو اپنے ساتھ شامل کرنے اور سازش کا حصہ بننے کا موقع کس طرح ملتا ... یہاں اسے سامنے پروفیسر صبّاری کو رکھنا تھا، خود پسِ منظر میں رہنا ... مطلب یہ کہ پکڑا جاتا تو پروفیسر صباری ... یہ محفوظ کا محفوظ رہتا، اس پر کسی کو شک نہ گزرتا اور اس طرح یہاں رہتے ہوئے اپنے اثر و رسوخ کے بل پر یہ پروفیسر صباری کو بھی چھڑا لیتا یا فرار ہونے کا سامان پیدا کر دیتا، تتلیوں کو یہ پہلے ہی اس عمارت میں پہنچا چکے تھے۔ تجربہ گاہ میں تو بس ہمیں ڈرامہ کر کے دکھانا چاہتے تھے تاکہ کل کو پروفیسر صباری پکڑا بھی جائے تو شنکی چانگ پھر بھی محفوظ رہے ... اس

لیے جب پروفیسر شنکی ہمیں تتلیاں دکھانے لگا تو تتلیوں کو غائب پا کر بے ہوش ہونے کا ڈرامہ کیا ... جھوٹ موٹ کا بے ہوش ہونا آسان نہیں تھا ، اس لیے کوئی دوا کھا کر یہ بے ہوش ہو گیا یعنی اس نے وہ سوئی اپنی کلائی میں چبھوئی تھی جس سے یہ فوراً بے ہوش ہو گیا تھا۔''

'' نہیں انسپکٹر جمشید ، تم غلط کہہ گئے ، میں نے کوئی ڈرامہ نہیں رچایا، مجھے واقعی پروفیسر صباری اغوا کر کے لے گیا تھا ، میرا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا ، میں تو اس ملک کے لیے کام کر رہا تھا ، یہ پن تو مجھے بیہوش کرنے کے لیے پروفیسر صباری نے میری کلائی میں چبھوئی تھی۔'' پروفیسر شنکی چانگ نے چلّا کر کہا ۔

'' منصوبہ بندی یہی تھی لیکن سوئی نے کام خراب کر دیا ... ''

'' سوئی پروفیسر صباری نے میری کلائی میں چبھوئی تھی تا کہ میں بیہوش ہو جاؤں کیونکہ میں ان کے قابو میں نہیں آیا تھا ۔''

'' یہی سوئی تمھاری شکست کا سبب بن گئی پروفیسر۔'' انسپکٹر جمشید نے طنزیہ انداز میں کہا ۔

'' آخر کیسے جمشید ... خود ہم بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ پروفیسر شنکی چانگ غلط بیانی نہیں کر رہا۔'' آئی جی صاحب بولے ۔

'' میں ثابت کرتا ہوں سر ...'' یہ کہہ کر انہوں نے گنگنانے والے انداز میں اکرام کو آواز دی :

'' کہاں ہو اکرام آواز دو تمھیں ہم یاد کرتے ہیں۔''

''حاضر ہوں میں آیا۔''

اس نے بھی گنگنانے کے انداز میں کہا اور سامنے آ گیا۔

''اکرام تمھیں پروفیسر کے ملازمین کو گرفتار کرنے کے لیے بلایا گیا تھا... بلایا گیا تھا نا۔''

''یس سر۔''

''پھر تمھاری موجودگی ہی میں پروفیسر نے ہمیں تتلیاں دکھانے کا پروگرام بنایا تھا۔''

''یس سر۔''

''اور پھر... پروفیسر صباری بے ہوش ہو گئے تھے... تم نے وہ سارا منظر کیمرے میں محفوظ کیا تھا جہاں پروفیسر بے ہوش ہو گئے تھے ... اس جگہ فرش پر ایک سوئی ملی تھی جس کی نوک پر خون لگا ہوا تھا۔''

''جی ہاں وہ تصاویر محفوظ ہیں۔''

''اور جب ہم واپس تجربہ گاہ پہنچے تھے تو پروفیسر وہاں نہیں تھے لیکن وہ سوئی اس وقت بھی وہاں موجود تھی۔''

''جی ہاں ؟''

''اور اس کا مطلب ہے... پہلی تصاویر میں سوئی کا موجود ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے بے ہوش ہونے کا ڈرامہ کیا تھا... اس سوئی کے ذریعے یہ خود بے ہوش ہوئے تھے... پروفیسر صباری نے انھیں سوئی سے بے ہوش نہیں کیا تھا۔''

جی ہاں ... تصاویر سے یہ بات سورج کی طرح روشن ہے۔''

'' شکریہ اکرام ... اور اب پروفیسر شنکی چانگ ، اب آپ کیا کہتے ہیں ، اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک آخری بات بھی بتا دوں۔''

'' آخری بات۔'' مختلف آوازیں ابھریں ۔

'' ہاں آخری بات ... پروفیسر شنکی چانگ اگر چہ ہمارے پڑوسی ملک شائنا سے سے یہاں آئے تھے ... انھوں نے خود کو شائنا کا ہی ظاہر کیا لیکن دراصل یہ انشارجہ کے ایجنٹ ہیں ۔''

''اوہ ... اوہ ۔''ان سب کے منہ سے نکلا ۔

'' ہم ثابت کر دیں گے کہ اس سازش کا جال انشارجہ نے بنا تھا ... انشارجہ کا مطلب یہ تھا کہ اگر منصوبہ ناکام بھی ہو جائے اور یہ لوگ پکڑے بھی جائیں تو بھی ہمارے ملک کے اور شائنا کے تعلقات خراب ہوں گے اور ایسا انشارجہ ہمیشہ چاہتا ہے ...''

'' یہ انشارجہ بھی کیا چیز ہے ، کتنے گھماؤ اور پھراؤ والے منصوبے بناتا ہے ، سارا ملبہ دوسرے ملکوں پر ڈال کر خود معصوم بن جاتا ہے۔''

''رہ گئی بات سہرے کی، بھلا اس کیس کا سہرا کس کے سر آیا۔''

'' میرا خیال ہے تھوڑا تھوڑا سبھی کے ۔'' فاروق نے فوراً کہا۔

ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں ...

صدر مملکت کی مسکراہٹ ان سب میں زیادہ گہری تھی۔

☆☆☆☆☆

آئندہ ناول کی ایک جھلک

آسمانی آوازیں

اشتیاق احمد

- پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ کے آلات نے عجیب سی کچھ آوازیں ریکارڈ کیں
- آواز سن کر پروفیسر داؤد کے ہوش اڑ گئے
- دارالحکومت کی اہم عمارتیں یکا یک زمین میں دھنس گئیں
- کوئی دھماکہ ہوا نہ کوئی زلزلہ آیا
- شہر میں خوف و ہراس کی لہر
- کچھ لوگ سڑک پر چلتے چلتے غائب ...
- کیا وہ آسیب تھا ... کوئی بدروح تھی۔

O فرزانہ چلتے چلتے رک گئی ...خوفناک آواز اس کے کان سے ٹکرائی

O اس باران کا واسطہ ایک عجیب وغریب کیس سے پڑ گیا

O لیکن وہاں تھا ہی کون جسے وہ پکڑتے

O صرف چند آوازیں، جوان کی بے بسی پر قہقہہ لگاتی تھیں۔

O آوازوں کا راز کیا تھا۔

O ایک عجیب وغریب ناول

O آسمانی آوازیں کیا چاہتی تھیں۔

O ان کا اصل نشانہ کون تھا۔

O یہ خوفناک ناول پڑھ کر آپ ایک عجیب سا اطمینان محسوس کریں گے۔

بہت جلد شائع ہو رہا ہے۔

گذشتہ ناول کی ایک جھلک

شیشے کی سازش

اشتیاق احمد

''تم یہ بات ذہن میں رکھ کر کام کرنا کہ یہ صرف اور صرف میرے خلاف سازش ہے اور اس سازش کی تیاریاں پہلے ہی کر لی گئی تھیں۔'' صدرِ مملکت نے یہ الفاظ انسپکٹر جمشید سے کہے۔

ڈاک سے ملنے والا لفافے میں نکلنے والی چیز شیشے کی گول ٹکیہ تھی۔

لفافہ بھیجنے والے کا نام سن کر بیگم جمشید چونک اٹھیں۔

انسپکٹر جمشید کے گھر پر فوج کا چھاپہ

مروڑی سے ملئے... ایک عجیب وامیر کردار

جب عجیب وغریب ہوسکتا ہے تو عجیب وامیر کیوں نہیں۔

محمود، فاروق، فرزانہ کیلئے اس راز سے پردہ اٹھانا چیلنج بن گیا۔

بلیومون ٹیکسٹائل سے بڑے بڑے افسران کیلئے بہت بڑی رشوت دی جارہی تھی... رشوت لینے والوں میں آئی جی صاحب بھی شامل تھے۔

خاور جلیس کون تھا... اور وہ کیوں چاہتا تھا کہ صدر مملکت ان تینوں کو فون پر زوردار انداز میں ڈانٹیں۔

انسپکٹر نوشاہی سے ملئے۔ وہ چاہتا تھا کہ انسپکٹر جمشید اس کے کیس کی تفتیش کریں۔

Inspector Jamshed Team,
Inspector Kamran Mirza Team
& Shoki Brothers

Ejad Ke Dehshutgerd

ایجاد کے دہشت گرد

پروفیسر شنکی چانگ کی ایجاد حیرت انگیز تھی...

موت کی تتلی سے ملیے...

دارالحکومت کے سب سے بڑے ٹاور پر پانچ چھ تتلیاں گردش کر رہی تھیں...

شہر خوفناک حالات کی لپیٹ میں... ملک کے صدر کو ملک بدر ہونا پڑا...

ان کے ساتھ جمشید پارٹی بھی تھی... اور جب ان کے لیے پروازیں بند کر دی گئیں...

ان حالات میں وہ کیا کر سکتے تھے... انھوں نے کیا کیا...

ایک ہولناک جنگل میں سیاہ رنگ کی بلاؤں نے انھیں گھیر لیا...

ان کے پاس ان سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا...

موت ان سے صرف چند انچ دور رہ گئی...

پہاڑوں کے درمیان گھری ایک پراسرار عمارت...

دشمن کی اصل طاقت چند تتلیاں تھیں...

Title Design - Asha Farooq

ISBN 978-969- 601-147-7
9 789696 011477

A-36 ایسٹرن اسٹوڈیوز کمپاؤنڈ، B-16 سائٹ، کراچی
0300-2472238, 32578273, 34268800
e-mail: atlantis@cyber.net.pk
www.inspector-jamshed-series.com

اٹلانٹس پبلکیشنز